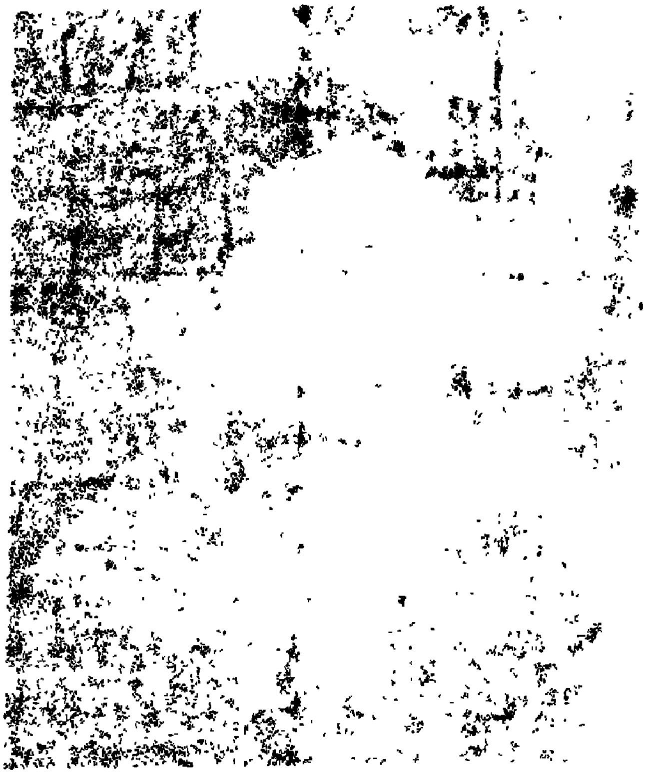
DUE DATE

Cl. No. *Acc. No.*

Late Fine Ordinary books **25 Paise** per day. Text Book **Re. 1/-** per day. Over Night book **Re. 1/-** per day.



ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتے میں شائع ہونے والا کثیر الاشاعت

مجلہ الہام دہلی کا

مدیر سید مسعود حسن شہاب دہلوی

مدیر اعزازی انور حیدری دہلوی

مہتمم نسیم چغتائی

قیمت سالانہ ۔ روساء سے ۔ والیان ریاست سے

جلد ۷ — بابت ماہ ستمبر سنہ ۱۹۴۶ء — نمبر ۵

نمبر شمار	مضمون	صاحب مضمون	صفحہ
۱	گفت و شنید	شہاب دہلوی۔	۲
۲	جرعات تلخ	خیام الہند حضرت حیدر دہلوی مدظلہ العالی۔	۳
۳	پریت کی ریت (افسانہ)	جناب گوپال کرشن صاحب دہلوی۔	۴
۴	مخمس	مسیح الکلام حکیم کیف دہلوی۔	۹
۵	ماں کی گریہ وزاری	جناب حمید زبیری صاحب بی، اے (علیگ)	۱۰
۶	شادی (افسانہ)	جناب شمیم ہاشمی، لکھنوی۔	۱۴
۷	مئے دو آتشہ	محترمہ راجکماری صاحبہ سندر، محترمہ زہرہ خاتون صاحبہ حیا۔	۱۵
۸	فنون لطیفہ	جناب خواجہ عبدالمجید صاحب بی، اے مدظلہ۔	۱۶
۹	طاق کسریٰ	جناب محمد خورشید حسن صاحب نازش حیدری دہلوی۔	۲۱
۱۰	ادب میں فرقہ پرستی	جناب گوری سرن صاحب سنبل گورکھپوری ایم، اے (علیگ)	۲۲
۱۱	کیف تغزل	حضرت علامہ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی مدظلہ۔	۲۷
۱۲	عاشق شادماں (افسانہ)	جناب اشرف صبوحی صاحب دہلوی۔	۲۸
۱۳	لمعات	انور حیدری دہلوی۔	[illegible]
۱۴	مصلحین ادب کے فرائض	شہاب دہلوی۔	۳۵
۱۵	انتخاب مشاعرہ سرکار ٹونک	مختلف شعراء حضرات	۴۲
۱۶	اشتہارات	مشتہرین حضرات۔	۴۸

باہتمام سید مسعود حسن شہاب دہلوی پرنٹر و پبلشر انصاری پریس میں طبع ہو کر دفتر رسالہ الہام جامع مسجد دہلی سے شائع ہوا

گفت و شنید

"الہام" اپنی گوناگوں دل آویزیوں اور خدمات ادب کے لحاظ سے بلا امتیاز مذہب و ملت ہر طبقے میں بے حد محبوب و مقبول ہے۔ لیکن ؎

آپ کو سخت غیر کو لذت ۔۔۔ یہ تماشا کباب میں دیکھا

بالکل اسی طرح "الہام" بھی اپنے قارئین کرام کی خوشنودیٔ خاطر کیلئے اپنے تن من کی بازی لگاتا رہا اور زیادہ سے زیادہ اردو ادب کی خدمت انجام دیتا رہا۔ اب تک جتنی علمی و ادبی خدمات "الہام" نے پیش کی ہیں وہ معمولی نہیں بلکہ ملک کے ہندو مسلم علما و ادب نے دل کھول کر قلمی و سخنی اعتراف کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارا نصب العین یہ ہے کہ "الہام" میں بہترین اور اعلیٰ درجے کا لٹریچر پیش کیا کریں اور اردو زبان کو ہنگامی حوادث سے محفوظ رکھنے اور تعصب کی آنکھ سے بچانے میں کوشاں رہیں مگر اس کا کیا علاج کہ "الہام" ان تمام مساعیٔ جمیلہ کے باوصف خسارے میں آتا جا رہا ہے۔ ہم ہمیشہ بتاتے رہتے ہیں کہ ہماری خدمات ادب کا مقصد ذاتی منفعت نہیں بلکہ ہر ماہ اپنی جیب سے کچھ نہ کچھ بھینٹ چڑھا دینا اور وہ اپنی سعادت سمجھتا ہے۔ پھر بھی تابکے؟

سفینہ چاہیئے اس بحر بیکراں کے لئے

ہمارے اس خیال سے قارئین حضرات متفق ہوں گے کہ نومبر سنہ ۴۱ء سے "الہام" کی قیمت میں ایسا اضافہ ہو جائے جو نہ ہونے کے برابر ہو۔ چنانچہ اکتوبر کے ... تک نئے خریداروں سے ... سالانہ لئے جائیں گے اور یکم نومبر سے سالانہ قیمت المضاعف طلب کی جائیگی اور وہ قیمت مبلغ ... سالانہ ہوگی۔ اب موقع ہے کہ قدردان "الہام" اور اہل ذوق اصحاب اس دو ماہ کے وقفے سے خود بھی فائدہ اٹھائیں اور اپنے احباب و متعلقین کو بھی توجہ دلائیں۔ قیمت میں اضافہ سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ "الہام" اسی رفتار پر رہیگا۔ بلکہ نومبر سے "الہام" کی ترتیب و تہذیب اور خصوصیات میں معتدبہ اضافہ ہوگا۔

ٹیگور نمبر ادارے نے فیصلہ کیا ہے کہ ہندوستان کے عدیم المثال ادیب و شاعر ڈاکٹر سر رابندر ناتھ ٹیگور کی شہرت و شخصیت اور کمالات علم و فن سے متعلق "الہام" کا "ٹیگور نمبر" عظیم الشان پیمانے پر شائع کیا جائے،

اس نمبر کے انتظامات شروع ہو چکے ہیں۔ ملک کے سربرآوردہ حضرات سے خط و کتابت جاری ہے۔ مشاہیر علما و ادبا سے مضامین لکھوائے جا رہے ہیں۔ کچھ مواد فراہم بھی ہو چکا ہے۔ قوی امید ہے کہ بلند پایہ اہل قلم حضرات خاطر خواہ ہمارا ہاتھ بٹائینگے اور ہم "ٹیگور نمبر" کو دیگر رسائل کے نمبروں سے کسی طرح پیچھے نہ رہنے دینگے۔ تاریخ اشاعت کا اعلان اور مفصل حالات و کیفیات اکتوبر کے "الہام" میں ملاحظہ فرمائیگا۔

مشتہرین حضرات کو چاہیئے کہ اپنی فرموں کے اشتہارات کیلئے ابھی سے صفحات وقف کرا لیں، کیونکہ یہ نمبر ہندوستان کے علاوہ دنیا کے بڑے بڑے ممالک سے بھی خراج تحسین حاصل کریگا۔ سر موصوف سے دنیا کا گوشہ گوشہ متعارف ہے۔ مقبولیت و شہرت غیر محدود ہے۔ اسی طرح "ٹیگور نمبر" کی اشاعت بھی کثیر اور غیر محدود ہوگی۔ تاجر حضرات کیلئے یہ موقع زرین موقع ہے۔ **(شہاب)**

جرعاتِ تلخ

خیّام الہند حضرت حیدر دہلوی مدظلہ العالی

کمال فن کے دشمن ابھی تو فن سے کیا نسبت؟
اگرچہ شہرت ابھی محفوظ ہے، شہرت کہاں تک ہے!
تو پھر ابلیس کا عہد زار کر ابلیس کی شہرت!
زمیں سے آسماں تک آسماں سے لامکاں تک ہے!

لاکھ ہو ضبط سخن لب پہ ہے تو غزل سی کچھ تو
اور جدت بھی ہے اب صرف ترے غم سے پیدا
لیکن افسوس ہے اب جدت کہ مقبول ہے نئے
عیب ہوتا ہے بیاں عہد غلامی مغرب سے پیدا

نازیبہ

جب سے یہ اہل ہوس نے غربت کی راہ لی
پیسہ لگے کس - رنج و محن ہیں ہے؟
غیرت نہ حفظ مراتب نہ نرمی خلق!
ہستی کا وطن کہاں کا وطن کیا وطن ہیں ہے؟

فقر و فاقہ ذلت و بغض و حسد
روح فرسا فکر و کاوشِ دل کا مآل
انسانیت و شیمن ملوک؟
واہ رے علم! لعنت بہ ... آہ رے ...

پریت کی ریت

پنالال کو عنفوان شباب تھا، نقش و نگار میں رنگ روپ کے اعتبار سے جیسی جاذبیت ہونی چاہیئے تھی، گردش زمانہ کے ہاتھوں ایسی نہیں رہی تھی۔ یہ ایک معمولی پنواڑی تھا۔ بازار کے ایک دبے ہوئے کونے میں ایک چھوٹی سی دکان تھی جس میں کچھ پرانے سگریٹوں کے ڈبے، خالی ماچس کے بیشمار بکس، چھوٹی سی الماری میں چنے ہوئے، کچھ نئے باز کی صورت میں رکھے ہوئے تھے۔ ایک پرانا آئینہ جس کی اکثر جگہ سے قلعی اتر چکی تھی سامنے آویزاں تھا۔ گدی کے سامنے ایک چھبڑی میں سرخ کپڑے پر کچھ بنے ہوئے پان۔ ایک آدھ ڈھولی سادے پانوں کی ایک پرانی سی ٹوکری میں رکھی رہتی۔ اس بے چارے کی دکان کی یہی چیزیں شوبھا تھیں۔

پنالال بہت محنتی اور جفاکش تھا۔ صبح پانچ بجے سے رات کے بارہ بجے تک گدی سے ذرا نہیں ہلتا۔ جما بیٹھا رہتا۔ رات کو وہیں دکان کے ایک گوشے میں دن بھر کا تھکا ماندہ پڑ جاتا۔ اور صبح ہی اٹھ کر یہی کام کاج میں مصروف ہو جاتا۔

بعض اوقات اپنے پتا کی یاد میں گدی پر بیٹھے بیٹھے کچھ آنسو بہانے لگتا اور نہایت بے کسی کے ساتھ بھگوان سے پرارتھنا کرتا کہ "ہے پربھو. تو نے پہلے میری ماتا کو مجھ سے چھڑایا تو اس پر بھی شانت نہ ہوا۔ میری زندگی کا سہارا اب ایک سایہ پتا جی کا رہ گیا تھا وہ بھی میرے سر سے اٹھا دیا۔ اچھا بھگوان؟

آج پنالال پہلے سے زیادہ رنجیدہ تھا۔ اس کے چچا نے لکھا تھا کہ تو اپنی یہ چھوٹی سی دکان چھوڑ کر میرے پاس چلا آ۔ مگر وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ اپنے پتا کی یادگار یہ چھوٹی سی دوکان بغیر کسی خاص وجہ کے چھوڑے اور برسوں کی جمی جمائی اور بسی بسائی دوکان پر کسی اور کو بٹھا دیکھے۔ حالانکہ دوکان کرایہ کی تھی۔ مگر اس کے پتا نے مرتے وقت وصیت کی تھی کہ "دیکھو بیٹا اسی دوکان کے بل بوتے پر ہم نے آبرو اور شانتی سے ساری زندگی بسر کی ہے۔ ویسے تو روٹی دینے والا بھگوان ہے۔ مگر یہ دوکان بھی اسی کا بتایا ہوا وسیلہ ہے۔ ہمیشہ خیال سے کام کرنا۔ اور بروں کی صحبت سے بچنا۔ اگر ایسا نہ کیا تو تم بھی برے ہو جاؤ گے۔ بس اس دوکان کو دیوی سمجھ کر اس کی رکھشا کرنا۔ ایشور تمہاری رکھشا کرے گا۔" پتا کے کانوں میں ابھی تک یہ الفاظ گونج رہے تھے۔ اس اثنا میں اس کے چچا کا ایک اور خط آیا اس میں بھی یہی لکھا تھا کہ تم وہاں پر سکھی نہیں ہو۔ یہاں آجاؤ میں تم کو خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔ پنا نے خط پڑھ کر دل میں کہا "سکھی تو میں یہاں بھی ہوں۔ وقت گذر ہی رہا ہے۔ پرماتما کی یہ بھی بڑی کرپا ہے۔ کہ عزت کے ساتھ بھوجن اور کپڑے میں کمی نہیں۔ پھر مجھے کیا چاہیئے؟ رہی میری اداسی اور بے کسی، کچھ دنوں کی ہے۔ سو یہ بھی جاتی رہے گی۔ دنیا آہستہ آہستہ سب کچھ بھلا دیتی ہے۔ میرے پتا سے دادا جی کو بھلا دیا تھا تو کیا یہ دنیا مجھ سے میرے ماتا پتا کو نہیں بھلائے گی۔ دل ہی دل میں یہ باتیں کر کے اپنے چچا کو جواب لکھا "آپ کی دیا اور بھگوان کی کرپا سے میں یہاں بھی بڑے آنند سے ہوں۔ ماتا پتا کے بغیر بھی وقت اچھا گذر جاتا ہے۔ اب میں نے آپ کی دعا سے کھا پی کر سات روپے جوڑ لئے ہیں۔ اور پرماتما کرے گا۔ اب میں چین سے ہوں۔ مجھے صرف آپ کی دعائیں چاہئیں اگر کسی چیز کی ضرورت ہوگی تو آپ کچھ دور نہیں ہیں۔

"کل دیوالی ہے! دوکان کو سجائیگا نہیں۔ دیکھ تو سہی سب دوکاندار ابھی سے اپنی اپنی دوکانیں سجا رہے ہیں۔" اس کے دوست رامو نے کہا۔

ہاں ہاں! کیوں نہیں سجائیں گے۔ دیکھ میں یہ آئینہ خرید کر لایا ہوں۔ کیوں کیسا ہے؟ اور شام کو کمہار دیئے بھی دے جائے گا۔

اب تو دیوالی ماتا خوش ہونگی نا؟ کیوں رامو۔۔۔

"کیوں نہیں خوش ہوں گی۔ اور یہ آئینہ تو بہت اچھا ہے۔ جب اس کے اردگرد دیئے جلیں گے۔ تو وہ بہت خوش ہوں گی"

آج دیوالی تھی پنّا نے اپنی حیثیت کے مطابق دوکان کو خوب سجایا۔ پرانے شیشے کی جگہ نیا شیشہ لگایا۔ کتنے چونے کی کلیاں بھی خوب چمک رہی تھیں۔ پنّا خود بھی صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ وہ پرانی ٹوپی جو اس کے پتا نے پچھلی دیوالی کو لے کر دی تھی۔ اس کی جگہ نئی ٹوپی اوڑھی یہ دیوالی پنّا کی زندگی میں اٹھارویں دیوالی ہے۔ آج وہ بہت خوش اور اپنے کام میں مصروف تھا۔

"پنّا! کیا حال ہے، خوش تو ہو" اس کے دوست رامو نے پیچھے سے آکر کہا۔

"ہاں رامو بہت اچھا ہوں۔ دیکھو میری دوکان کیسی اچھی اور کتنی سجی ہوئی ہے۔ کیا کوئی مقابلہ کرسکتا ہے؟"

"بالکل ٹھیک کسی کی کیا مجال ہے کہ مقابلے پر آئے۔ آخر پنّا بھیا کی دکان ہے" یہ کہہ کر رامو سے۔ دوکان پر اس کے پاس بیٹھ گیا۔

"پنّا آج تو خوب بکری ہو رہی ہے"

"ہاں ابھی تو خوب بکری ہوگی۔ میں ابھی تو دوکان کو اور سجاؤں گا۔ یہ بالٹی بھی پرانی ہوگئی ہے۔ اس کی جگہ نئی خریدوں گا۔ اور اور چیزیں بھی دوکان میں بڑھاؤں گا۔ پھر شان نکلے گی"

"اچھا تو آج سیر کو تو چلو گے یا ہمیشہ کی طرح بیٹھے رہو گے"

"آج کا دن کہیں جانے کا ہے؟ دیکھو تو سہی کتنا نقصان ہو جائے گا۔ آج کمائیں گے کل سیر کو جائیں گے۔ اور سیر تو روز ہو سکتی ہے اور ایسے دن کب کب آتے ہیں"

"اچھا بھائی جیسی تمہاری مرضی۔ میں آج تمہارا ہاتھ بٹاؤں گا۔ مٹھائی کھلاؤ گے؟"

پنّا اور رامو آج خوب مصروف ہوگا ہک پر گاہک ٹوٹا پڑتا تھا۔ بات کرنے اور دم لینے کی فرصت نہیں تھی۔ روز تو بارہ بجے دوکان بند ہوتی تھی۔ آج رات کا ڈیڑھ بج گیا بمشکل تمام دونوں کو فرصت ہوئی۔ رامو نے کہا: "اب میں گھر جاتا ہوں صبح آؤں گا"

پنّا سونے کی تیاری کر رہا تھا کہ رادھا اپنے نازک نازک حنائی ہاتھوں میں مٹھائی کی ٹوکری لئے ہوئے دوکان کے سامنے آئی اور خاموش کھڑی ہوگئی۔ پنّا کی جو اس پر نظر پڑی تو چونک اٹھا۔

اب رادھا تقریباً عمر کی چودھویں منزل میں تھی۔ درمیانہ قد، بھرا بھرا جسم، سبیح رنگ، پیازی رنگ کی بنارسی ساڑھی میں ملبوس اس کا چہرہ رات کی تاریکی میں چودھویں رات کے چاند کی طرح چمک رہا تھا، سرخ بندی کی جوت 'بوپنے' کے دل میں بری طرح چھید رہی تھی۔ رادھا اسی زمانے میں پنّا کی پڑوسن تھی اور دونوں ساتھ کے کھیلے ہوئے تھے۔ آج بہت دن بعد ایک دوسرے کو تنہائی میں ملنے کا موقع ملا تھا۔ حالانکہ پنّا [illegible] دل سے بھلا چکا تھا۔ مگر اب سامنا ہوتے ہی پرانی چوٹ ابھر آئی۔ گھبرا کر بولا: "رادھا اتنی رات گئے تم کہاں؟" رادھا خاموش رہی۔ پنّا نے دوسری مرتبہ بھی یہی الفاظ دہرائے۔

رادھا: سوامی روتھ [illegible] تم کو منانے کے لئے مٹھائی لائی ہوں۔

"رادھا یہ تم نے کیا کیا۔ میں تمہیں بھول چکا تھا۔ تم مجھے پھر ستانے آگئیں۔ تم نہیں جانتیں کہ میں پہلے ہی کا ستایا ہوا ہوں پھر بچپن کا وقت اور تھا۔ اب وقت اور ہے۔ اگر کوئی دیکھ پائے گا تو کیا کہے گا۔ تمہیں میری قسم تم چلی جاؤ"

اس کے جواب میں رادھا منہ سے کچھ نہ بولی۔ مگر اس کی آنسوؤں نے آنکھوں سے ٹپک ٹپک کر جواب دیا۔

"رادھا تم رو رہی ہو۔ کیا خود رو کر مجھے رلانے آئی ہو؟"

پنا یہ کہکر خود بھی رونے لگا۔ ہرچند خود کو سنبھالا۔ مگر نہ سنبھل سکا حتیٰ کہ فرطِ شوق میں ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈال کر خوب روئے۔ کسی قدر طبیعت سنبھلی تو پنا نے کہا: "تم اکیلی آگئیں تمہیں ڈر بھی نہیں لگا؟"

رادھا۔ ڈر کیسا؟ ماتا پتا لیلا دیکھنے گئے ہیں۔ مگر میں ان کے ساتھ نہیں گئی۔ کیونکہ مجھے اپنے سوامی کی لیلا دیکھنی تھی۔

پنا۔ رادھا! تم نے میری لیلا دیکھ لی؟ خوش ہو گئیں؟ دیکھو تم نے میری لیلا شروع کر دی۔ میں تو سب کچھ بھول چکا تھا تم نے غضب کیا مرا مرجھایا ہوا دل ہرا کر دیا۔ رادھا! تمہارے ماتا پتا نے تو مجھے بھلا دیا ہوگا۔ لیکن تم نے مجھے کیوں نہیں بھلایا۔

رادھا۔ سوامی تم یہ کیا کہہ رہے ہو۔ میں ایسی باتیں زیادہ برداشت نہیں کر سکتی۔

پنا۔ رادھا تم جوان ہو گئی ہو۔ تھوڑے دنوں میں تمہارے والدین تمہاری شادی کر دیں گے۔ مگر وہ ایک معمولی پنواڑی سے نہیں کریں گے۔ وہ کسی دولت مند سے تمہاری شادی کریں گے۔ تم اپنے گھر میں خوش رہوگی۔ آخر جب بھی مجھے بھولوگی؟

رادھا۔ پریتم...... یہ کہنے کے بعد کچھ نہ کہہ سکی۔ اس کا دل بھر آیا۔ اور زار و قطار رونے لگی۔

پنا۔ رادھا نہ رو۔ تم نہیں جانتیں کہ میرے دل پر کیا گذر رہی ہے۔ پرماتما کے لئے مجھے بھول جاؤ۔

رادھا۔ پریتم! میں سب کچھ بھول سکتی ہوں۔ لیکن تمہیں نہیں بھول سکتی۔ تم میرے لئے سب کچھ ہو۔ تمہیں میرے دیوتا ہو۔ اور تمہارے ہی چرنوں میں اپنی تمام زندگی گذارنا چاہتی ہوں۔

پنا۔ مگر یہ کیسے ہوگا۔ تمہارے والدین تو مجھ سے شادی کرنے سے رہے تمہیں معلوم ہے کہ میں ایک یتیم لڑکا ہوں۔ اور اسی کیسا غریب پنواڑی بھی۔ تمہارے پتا میرے پتا کے متر ضرور تھے۔ لیکن جب سے پتا جی بیکنٹھ باشی ہوئے۔ انہوں نے آج تک درشن نہیں دئے۔ پتا جی کی زندگی میں تو بیٹا بیٹا کہہ کر مجھے پیار کرتے تھے۔ مگر جب سے میں یتیم ہوا کوئی بیٹا کہنے والا نہیں رہا۔ بہتر تو یہی ہے کہ تم مجھے بھولنے کی کوشش کرو۔ اور میں بھی تمہیں پھر بھول جاؤں۔ مجبوری بری چیز ہوتی ہے۔ اور میں بھی مجبور ہوں۔

رادھا:۔ مجبوری میں سب کچھ ہو سکتا ہے۔ مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ میں اپنے سوامی کو بھول جاؤں میری زندگی کا سب بڑا مقصد آپکی سیوا کرنا ہے۔ میرے ارادے کو کوئی نہیں بدل سکتا۔ میں جب تک زندہ رہوں گی سوامی کے چرنوں میں رہوں گی اور جب مر جاؤں گی تو بھی رکھشا لیجاؤں گی۔ پرماتما گواہ ہے۔ کہ میں اپنے پریتم کو نہیں چھوڑ سکتی میں اپنے چاند سے پریتم کی چکور ہوں۔

پنا۔ رادھا تم کتنی بھولی اور معصوم ہو، اچھا جو بھگوان کریگا، وہی ہوگا۔ اب تم جاؤ۔ پانچ بجنے والے ہیں، تمہارے ماتا پتا بھی گھر پر آگئے ہوں گے۔

رادھا چلی گئی پنا نے کچھ منٹ سوچا اس کے بعد دوکان لگائی اور سجانی شروع کی۔ اسی عرصے میں رامو بھی آگیا بولا: "بھیا کیسے ہو۔ آج تو بہت موٹے معلوم ہوتے ہو؟"

"ہاں ہاں! میں موٹا تو ہو ہی گیا ہوں۔ رامو تم ٹھیک کہتے ہو۔"

"پنا بھیا میں اب مزدوری پر جاتا ہوں۔ شام کو واپس آؤں گا تو مٹھائی لوں گا۔"

"دیکھو رامو میں نے تمہارے لئے مٹھائی منگا رکھی ہے۔ وہ سامنے الماری میں رکھی ہے لیلو۔"

"یہ کہاں سے آئی؟"

"کہیں سے آگئی تھی۔ اپنا حصّہ میں نے کھا لیا اور تمہارا رکھ دیا تھا۔"

"پنا تم تو بڑے اچھے بھیا ہو۔"

پنا تمام دن دوکان پر رہا۔ شام کو رامو محنت مزدوری سے فارغ ہوکر دوکان پر آیا۔ "چلو پنا بھیا کل تم نے کہا تھا سیر کو چلیں گے۔"

"ہاں! ہاں! کیوں نہیں۔"

"اچھا تو پھر گھر ہو آئیں۔"

پنا۔ کیوں رامو یہ سماج غریبوں کا تو نہیں، دولت مندوں کا ہے؟

"ہاں بھتا یہ بات چھپی ہوئی تھوڑی ہے۔"

ان کے آرام و آسائش کے لئے سب کچھ ہے۔ ہم تمام دن محنت مزدوری بھی کرتے ہیں تو پیٹ بھر کر کھانے کو ملتا ہے اور نہ سکھ کی نیند ملتی ہے۔ بہت سے بھائی تو ہمارے ایسے ہیں جن کو کئی کئی وقت کے فاقے گذارنے پڑتے ہیں۔ رامو ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ آخر ہم بھی تو اسی پرماتما کے پیدا کئے ہوئے ہیں۔ جس کی مخلوق یہ سیٹھ ساہوکار ہیں۔

"بھیا اس سوچ وچار میں نہ پڑو۔ اس سنسار کی گہرائیوں میں الجھو گے تو پاگل ہو جاؤ گے۔ پرماتما نے جو کچھ کیا ہے ٹھیک کیا ہے۔ ہم پھر ہزاروں سے اچھے ہیں۔ اگر وہ ہمیں اندھا، لنگڑا لولھا بنا دیتا تو کیا ہوتا۔ پنا وہ بڑا دیالو ہے۔ اس کی کوئی بات مصلحت سے خالی نہیں ہے۔ اس قصے کو چھوڑو۔ دوسری باتیں کرو۔

پنا۔ رامو رات کو رادھا آئی تھی۔

رامو۔ کیوں؟

پنا۔ مٹھائی دینے کے لئے۔ اور گیا ہوا وقت یاد دلانے کے لئے۔

رامو۔ پھر کیا ہوا؟

پنا۔ یہی ہوا کہ اس بے چاری نے اپنے دکھی دل کی کتھا سنائی۔ رامو! وہ بڑی بھولی اور بے قصور ہے۔ اُسے اس سنسار کے کرتوت کیا معلوم۔ وہ نہیں جانتی کہ پریم کا نتیجہ کیا ہوا کرتا ہے۔ بہتیرا سمجھایا مگر وہ نہیں سمجھی۔ اگر میرا اس دھرتی پر کوئی نہیں ہے تو کیا ہے اس کے تو بہت ہیں۔

رامو۔ خیر۔۔۔۔۔ وہ اب آئے تو منع کر دینا۔ تمہاری آبرو کا سوال ہے۔ اگر کوئی مصیبت پڑ گئی تو کون سنبھالے گا۔

دن ہوا کی طرح گذرتے ہیں۔ آج جو بات نئی ہے۔ آنکھ بند کرتے پرانی ہو جاتی ہے۔ اسی طرح دیکھتے ہی دیکھتے ایک اچھے دولت مند خاندان میں رادھا کی منگنی ہو گئی۔ جب پنا نے سنا تو بہت بے چین ہوا۔ مگر کیا کر سکتا تھا۔ "نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن" نتیجہ یہ ہوا کہ شادی سے ایک روز قبل رات کے جھٹپٹے میں رادھا پنا کی دوکان پر آئی۔ آج رادھا کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ گلاب سے نازک نازک رخسار مرجھائے ہوئے تھے۔ چہرے پر زردی کھنڈی ہوئی تھی۔ دوکان کے سامنے گر دملال کا پتلہ بن کر کھڑی ہو گئی۔ پنا نے جو نظر اٹھائی تو سوانگ دیکھا۔ ایک سرد آہ بھر کر آہستہ سے کہا "رادھا! آج کیوں آئی ہو؟"

رادھا۔ میں سوامی سے آج فیصلہ کرنے آئی ہوں۔ اور یہ کہنے آئی ہوں کہ پریتم ہمیں یہ جگہ چھوڑ دینی چاہئے۔ اس شہر سے دور کسی ایسی جگہ چلے جائیں۔ جہاں ہمیں کوئی پا سکے نہ ہمارے راحت اور سکھ کی گھڑیوں میں کوئی شریک ہو۔ بس میرے سوامی ہو اور میں انکی داسی

پنا۔ یہ کیا کہہ رہی ہو! ایسا کرتے ہوئے لاج نہ آئیگی۔ کیا تمہارے ماتا پتا کی ناک نہیں کٹے گی۔ کیا میرے ماتا پتا کی آتما بے چین نہ ہوگی۔ رادھا بڑی جگ ہنسائی ہوگی خاندان کو بٹہ لگانا اچھا نہیں۔ میں نے تمہارے ہونے والے پتی کو دیکھا ہے۔ وہ بہت سندر ہے امیر بھی ہے، شریف گھرانے کا بھی۔ پھر تمہیں کیا چاہئے۔ دیکھو رادھا میری اور اپنی زندگی خطرہ میں نہ ڈالو۔ جب تک تمہارا سوامی تجویز نہیں

کیا گیا تھا۔ تم نے مجھے سوامی سمجھا۔ اچھا کیا۔ لیکن اب وہی تمہارا سوامی ہے۔ میں تم دونوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گا۔ میں تمہارے لائق نہیں تھا۔ جیسی تو پرماتما نے ایک چندرما سا بر ڈھونڈھ دیا۔ میں تمہاری شادی پر تمہارے گھر آؤں گا۔ دولہا دلہن کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گا رادھا صورت تکنے لگی۔ سر سے پاؤں تک کانپ رہی تھی۔ لب خشک ہو چکے تھے۔ زبان جنبش سے عاری تھی۔ بہت دیر تک رادھا بنا کی صورت ملتجیانہ انداز سے دیکھتی رہی اور آنکھوں سے آنسو گرتے رہے۔ جب کوئی چارۂ کار نہ دیکھا تو لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے پیچھے ہی افتاں و خیزاں گھر کا رخ کیا۔

آج رادھا کی شادی تھی۔ بنّا ناخواندہ مہمان کی طرح رامو کو ساتھ لے کر رادھا کے گھر گیا۔ اور شادی میں شریک ہوا۔ وہاں شہنائی کی آواز سے براتیوں کے دل میں سرور۔ اور شادیانوں کی صداؤں سے لب متبسم ہو رہے تھے۔ لوگوں کے چہروں پر بشاشت اور طبیعتوں میں امنگیں جوش مار رہی تھیں۔ مگر یہاں بنّا کے دل کی دھڑکن حد سے بڑھی جا رہی تھی۔ نگاہیں نہایت مایوسی سے ایک ایک کو تکتی تھیں۔ اور نا امید و مایوس ہو کر گر جاتی تھیں۔ بار بار آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اور بنّا نے جی کڑا کر کے پی لئے۔ پھیروں کے لئے پنڈتوں نے دولہا دلہن کو جب آمنے سامنے بٹھایا۔ تو بنّا سے برداشت نہ ہو سکا۔ آنکھوں سے طوفان اشک امڈا ہی چاہتا تھا کہ ... ... رومال سے منہ ڈھانک کر رامو کے ساتھ مجلس شادی سے باہر آ گیا۔ اور بمشکل بھرائی ہوئی آواز میں رامو سے کہا۔ "بھیا اب اس شہر میں ہمارے رہنے کا کام نہیں اگر جیون اور آبرو درکار ہے تو سنسار کے کسی ایسے گوشے میں چل کر رہو۔ جہاں رادھا کی یاد نہ آ سکے۔ اگر آئے بھی تو تھک کر راستہ میں کہیں بھٹک جائے۔

دوسرے دن صبح کو شمشان بھومی سے رادھا کی راکھ اڑ کر جمنا جی میں بنّا کی لاش سے ہم آغوش ہو رہی تھی اور اوپر سے عشق و محبت کے دیوتا اس عبرتناک سنگم پر مبارکباد کے پھول برسا رہے تھے۔

گوپال کرشن دہلوی

تضمین

برغزل خیام الہند حضرتِ حیدر دہلوی مدظلہ العالے

اثر مسیح الکلام فخر الاطبا حکیم ہاشم جان صاحب. کیفؔ. دہلوی

دیکھا بھی انجمن سے کبھی تونے آکے پاس　　ایمان و دیں کہاں دل کفر آشنا کے
ہاں، شوق حق رسی کا ہے مجھ مبتلا کے، پاس　　جی چاہتا ہے تجھ کو کسی دن بٹھا کے پاس
کھو جاؤں تیرے جلوؤں میں پہنچوں خدا کے پاس

ارمان دل کا دل میں رہا، وائے بے خودی　　پردہ اٹھا جو رخ سے، دل و جاں پہ، بن گئی
مطلق مجھے خبر نہ رہی، عقل و ہوش کی　　کیا خوب آرزوئے نظارہ کی داد دی
مجھ کو بھی مجھ سے دور کیا، تمنے آکے، پاس

ہر چند میں شریک سرِ رہ گذر، نہ تھا　　لیکن، عدو کی چال سے بھی بے خبر نہ تھا
کیا وجہ تیرے ساتھ کوئی فتنہ گر نہ تھا　　کس طرح مان لوں کہ کوئی ہم سفر نہ تھا
یہ کس کا نقشِ پا ہے، ترے نقشِ پا کے پاس

دنیا کے لوگ، کیوں نہ خدائی کی داد دیں　　اُن کو خدا کہیں، کہ خدا کو خدا کہیں
اب کافران عشق کریں بھی تو کیا کریں　　دنیا کو لا رہے ہیں، یہاں بھی فریب میں
بیٹھے ہوئے ہیں حشر میں، وہ بھی، خدا کے پاس

آثار، اُس میں حسن پرستی کے کیا نہیں　　مانوس بھی حسینوں سے اشعار بھی حسیں
اے کیفؔ، بدگماں ہیں بجا، عالمانِ دیں　　حیدرؔ کے اتقا و ورع کا کسے یقیں
جب دیکھئے کسی نہ کسی، مہ لقا کے پاس

ماں کی گریہ وزاری

آہ! دور تھی میں تجھ سے ... بہت دور۔
وہاں جہاں تیرا خیال بھی نہ جا سکتا تھا۔
میں تجھے یاد کرتی ... تو تیرا وظیفہ پڑھتی۔
دن سامت و ساکت معلوم ہوتے تھے۔
گھڑیاں کاٹے نہ کٹتیں ... تجھے میرا خیال۔
مجھے تیری یاد ... اسی طرح دن گذرتے گئے
شاید میری جدائی ... برداشت نہ ہو سکی تجھ سے .....
نہ تو میرے پاس آ سکتی تھی۔
نہ میں تجھ تک جلد پہنچ سکتی تھی ... چند دن گذر گئے ...
ایک ..... دو ... تین ... چار ... مجھے کوئی لینے آیا
... تو بیمار پڑ چکی تھی ... میں آئی ... تو جا چکی تھی ....
کہاں؟ ... وہاں ... اس عالم میں جو سب کی آنکھوں سے
پوشیدہ ہے۔

وہاں جہاں سب کو جانا ہے۔
فرشتے تجھے لے جا چکے تھے۔
اس دنیا میں جس میں معصوم روحیں رہتی ہیں۔
میں نے آنے میں دیر کی۔
تو مجھ سے خفا ہو گئی شاید۔
مگر ایسی خفگی تو نہ کی ہوتی۔
اے انجم! تجھے ماں ... اپنی دکھیاری ماں
کا خیال بھی نہ آیا۔
ہاں! تو معصوم تھی۔ تجھے ماں کی محبت کا کہاں گمان؟
تو چلی گئی ... اجل کے سنہرے پروں پر اڑ گئی۔
اجل تجھے افق کی اس پار والی دنیا میں لے گئی۔
کیونکہ تو خوبصورت تھی ... چاند کے مانند۔
معصوم تھی ... ہرن کے مانند۔

خدائے تعالےٰ نے ایک روز۔
فرشتۂ زندگی کو اپنی درگاہ میں طلب کیا۔
تیری معصوم روح کو۔
اس کے سپرد کر دیا ... فرشتۂ زندگی کو تیرے اوپر ناز تھا
تو پہلی روح تھی ... خوبصورت ترین۔
تو پہلی روح تھی ... معصوم ترین
ان سب میں جو اب تک فرشتۂ زندگی کو ... دی گئیں تھیں،
اجل ... فرشتۂ اجل ... کہیں کونے میں چھپا بیٹھا تھا۔
حسد کی آگ اس کے دل میں بھڑک اٹھی۔
اس نے فرشتۂ زندگی سے تجھے چھین لینا چاہا۔
وہ نکلا ہتھیاروں سے ... مسلح۔
دونوں فرشتوں میں گتھم گتھا ہوئی ... کچھ عرصہ تک۔
تو نے ایک ہچکی لی ... اور تو۔
گود میں جا پڑی فرشتۂ اجل کے ... وہ خوش ہو گیا
فرشتۂ زندگی رو رہا تھا ... اس کی دولت کھو چکی تھی۔
موت کا فرشتہ تجھے لے اڑا ... اونچا ... بہت اونچا۔
کہ نظروں سے غائب ہو گیا۔

کاش میں موجود ہوتی تیرے پاس۔
فرشتہ اجل کی خوشامد کرتی۔
اس کی منتیں کرتی ... مگر نہیں۔
وہ تو تیری محبت میں دیوانہ تھا ... مجھے جھٹک دیتا۔
میری آہیں نہ سنتا۔

اسے تو، تو چاہیے تھی ...... وہ تجھے ہی چاہتا تھا... لے گیا۔

ماں کی پرواہ نہ کرتا

اب تو اس سنہری دنیا میں پہنچ گئی۔

اس ناپائدار دنیا کی بے ثباتی تیرے شایان شان نہ تھی۔

اس رتیلی دنیا کو۔

تو نے ہمیشہ کے لئے۔

خیرباد کہہ دیا۔

مگر اے انجم! کیا تجھے خبر ہے کہ اس دنیا پر کیا گذر رہی؟

صبح آفتاب تیری تلاش میں نکلتا ہے۔

تجھے نہ پاکر۔ مایوس اور کمزور ہوکر شرمندگی سے منہ سرخ چھپ جاتا ہے۔

بوڑھا... ضعیف چاند... جس کی کمر جھکی ہوئی ہے۔

نکلتا ہے۔ تیری تلاش میں۔

مگر خود ہی گم ہو جاتا ہے۔

دوسرے دن زیادہ آب و تاب سے آتا ہے۔

شاید وہ تجھے ڈھونڈ نکالے گا۔

کیونکہ ہر رات وہ زیادہ ضوفشانی سے نمودار ہوتا ہے۔

مگر نہیں... چودہ دن تک متواتر تلاش کرنے کے باوجود وہ تجھے نہیں پاتا

اور پھر گھٹنا شروع ہو جاتا ہے۔

اس کی کمر جھک جاتی ہے۔

شفق تیری یاد میں خون کے آنسو روتی ہے۔

پھول آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تجھے اِدھر اُدھر دیکھتے ہیں۔

مگر نہ پاکر۔ مایوسانہ مرجھا جاتے ہیں۔

بلبل ان کی ناکامی پر روتی ہے۔

آسمان... نیلا آسمان

اپنے دامن میں ستاروں کے پھول تیری نذر کرنے کو آتا ہے

تجھے یاد ہے۔ تو ستاروں سے محبت کرتی تھی۔

آسمان کا دستور ہو گیا ہے کہ وہ روزانہ پھول لایا کرے۔

آہ! انجم آ! کہ نظام قدرت بدل گیا ہے۔

تیری یاد میں درختوں نے اپنے بال نوچ ڈالے۔

ہوا نے اپنے بدن پر خاک مل کر سادھو کی وضع اختیار کرلی۔

آبشاروں نے پہاڑوں پر آہ و زاری شروع کردی

فاختہ نے تیرے صدمے سے اپنی گردن میں کالا کنٹھا ڈال لیا۔

پروانے شمع پر آکر نذر آتش ہو رہے ہیں۔

زندگانی کا مزہ جاتا رہا۔

ہاں! زندگی شکست کھا چکی ہے۔

رات نے تیری یاد میں سیاہ لباس پہن لیا۔

چاند کا چہرہ فق ہو چکا ہے۔

وہ سوچ سوچ کر اپنی منزل طے کر رہا ہے۔

برق! موت کی سہیلی۔

بہت خوش ہے...

اس کے قہقہے۔

ہواؤں میں... ساری کائنات میں

گونج جاتے ہیں۔

آہ! انجم آ! کہ سارا انتظام بدل چکا ہے۔

تو اس خوبصورت دنیا میں ہے۔

بتا انجم! وہ کیسی دنیا ہے؟

وہاں کی زندگی کیسی ہے؟

کیا وہاں تجھ سے۔

مجھ جیسی محبت کرنے والی ماں۔

موجود ہے؟

کیا وہاں تیرے ساتھ پیار کرنے والا بابا سا بھی کوئی شخص ہے؟

اگر نہیں۔

تو پھر تو نے وہاں جانا پسند کیوں کیا؟

واپس آجا انجم! کہ میں تیرے انتظار میں بیٹھی ہوں۔

مجھے معلوم ہے۔

تو نہ آئیگی۔

وہ دنیا بہت عمدہ ہے۔
تو بادلوں پر بیٹھ کر سیر کرنے جاتی ہوگی۔
سونے اور چاندی کی رکابیوں میں فرشتے تجھے کھانا کھلاتے ہونگے
تو اطفالِ ملائک کے ساتھ طرح طرح کے کھیل کھیلتی ہوگی۔
تیرے سنہرے۔ گھونگر والے بالوں پر۔
ایک سونے کا تاج رکھا ہوا ہوگا۔
اب بھی۔
شاید اس دنیا نے حسن و معصومیت کی ملکہ فوت ہوگئی ہوگی
اس دنیا کو ایک ملکہ کی ضرورت تھی۔
فرشتہ اجل کو۔۔ جو کہ وہاں قیدی ہوگا۔
یہ کام سپرد کیا گیا کہ وہ
تجھے اس خاکی دنیا سے اٹھا لائے۔
وہ آیا اور تجھے لے گیا۔
تو وہاں کی رانی ہوگئی۔۔۔ رعایا نے جشن منایا ہوگا۔
اس وقت تو۔
ہیرے اور جواہرات سے مرصع تخت پر بیٹھی ہوئی حکم صادر کر رہی ہوگی
حوریں اپنے لانبے لانبے نازک پروں سے۔
تیرے اوپر سایہ کئے ہوئے ہوں گی۔
دربار ختم ہو جاتا ہوگا۔
ایک حور تجھے اپنے پروں پر بٹھا کر محل میں پہنچا دیتی ہوگی۔
کمرہ میں پھولوں کا ایک بستر بچھا ہوا ہوگا۔
مگر انجم! پیاری انجم! بتا۔
کیا تجھے اس بستر پر
وہی لطف حاصل ہوتا۔۔۔ ہے جو میری گود میں ہوا کرتا تھا!
اگر نہیں۔
تو پھر تو میرے پاس کیوں نہیں آجاتی۔
اے انجم! آجا۔
کہ میری گود تیرے واسطے خالی ہے۔

فرشتے اپنے نازک پروں سے۔
تجھے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا دیتے ہونگے۔
حوریں لوریاں سناتی ہوں گی۔
اور تھپک تھپک کر سلا دیتی ہوں گی۔
تو سو جاتی ہوگی۔
انجم! بتا۔۔۔ کہ تجھے اس دنیا کا خیال آتا ہے یا نہیں!
کیا تو خواب میں۔
اپنی چاہنے والی۔
مگر بچھڑی ہوئی۔
ماں کو دیکھتی ہے؟
نیند سے فارغ ہو کر تو مشک وغیرہ سے غسل کرتی ہوگی۔
اور پھر شام کا لباس پہنکر۔
باغ کی سیر کو نکلتی ہوگی۔
ریشمی ڈوریوں کا جھولا تیرا انتظار کرتا ہوگا۔
تو بیٹھتی ہوگی۔
حوریں تجھے جھونکے کھلاتی ہوں گی۔
دریا جنبش میں آجاتے ہوں گے۔
کلیاں پھول بن جاتی ہوں گی۔
طیورانِ بہشتی مصروف نواسنجی ہو جاتے ہوں گے۔
تو اِدھر اُدھر خراماں خراماں ٹہلتی ہوگی۔
پریاں اور حوریں تیرے اوپر پھول نچھاور کرتی ہوں گی۔
اس قدر کہ تو پھولوں میں لد جاتی ہوگی۔
راستہ میں پھول ہی پھول ہوتے ہوں گے۔
دودھ اور شہد کی نہریں جاری ہوں گی۔
یہ سب کچھ۔
مگر کیا تیرا دل اداس نہ ہوتا ہوگا؟
کیا تجھے اپنی ماں کا خیال نہ ستاتا ہوگا؟
کیا تجھے اپنی پرانی سہیلیاں یاد نہ آتی ہوں گی۔
اگر یہ سب کچھ ہے تو پھر۔

اے انجم! آجا کہ سب تیرے انتظار میں چشم براہ بیٹھے ہیں تجھے بلاتی ہے۔

تیری چھوٹی ننھی سی بہن۔

وہ "تیری بہن"

جس کے اوپر تو نثار تھی۔

وہ بہن۔

مگر آہ! مجھے معلوم ہے ... ...

اچھی طرح معلوم ہے ... ...

تو نہیں آئے گی ..... تو نہیں آسکتی ... ... تجھے نہیں آنے دیا جائے گا ..... !!!

حمید زبیری بی اے علیگ

(ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کے ایک مختصر افسانہ کا ترجمہ)

شادی

شام ہو چکی تھی۔ دولہا کے محل میں داخل ہوتے ہی ناقوس اور گھڑیالوں کی پرشور آوازوں سے تمام محل گونج اٹھا۔ ہال کی ہزاروں شمعوں کی روشنی سے سونا اور جواہرات جھلملا رہے تھے۔ ہر شخص کا چہرہ مسرت اور خوشی سے تمتما رہا تھا۔ شہزادہ اور اس کی دلہن تمام عمر کی یکجائی کے لئے شادی کی گرہ سے منسلک کر دیے گئے

دفعتاً جنگی بگل کی آواز سنائی دی اور ایک سپاہی تیزی سے محل میں داخل ہوا۔ تمام متوحش درباری اس کے گرد خبر سننے کے لئے جمع ہونے لگے۔ مگر سپاہی بغیر سانس لئے ہوئے بلند آواز سے بولا "باغیوں نے راجدھانی پر حملہ کر دیا ہے۔ رانا رام سنگھ میدان جنگ جا رہے ہیں۔ انہیں تمہاری مدد کی ضرورت ہے آؤ ...... بہادر اور قوی ہیکل وطنی راجپوتو۔ آؤ۔ ... ..."

"مارواڑ کے رانا رام سنگھ کی فتح ہو!" سپاہی کی آواز سارے ہال میں گونج گئی۔

"مارواڑ کے رانا رام سنگھ کی فتح ہو!" شہزادے کی گرجدار آواز بھی سنائی دی اس آواز سے شہزادی کا دل لرز گیا اور اس کی سیاہ اور بڑی بڑی آنکھوں میں موتیوں کی طرح چند آنسو چمکنے لگے۔

"ناموس وطن پر فدا ہو جانے والے راجپوتو ...... آؤ .. ... !" سپاہی ایک بار پھر چلاتا ہوا بولا "آؤ ... ... متری کے شہزادہ ... ... آؤ۔ اب ایک لمحہ بھی ضائع کرنے کا نہیں ہے۔"

ناقوس اور گھڑیالوں کی آوازیں اب بند ہو گئی تھیں شہزادہ نے دلہن کے آنچل سے اپنی گرہ کھول دی اور وہ اپنی نوعروس کی آنکھوں کی گہرائیوں میں نظر جمائے ہوئے بولا "الوداع! اے شہزادی مجھے وطن کے مظلوموں اور زخمیوں کی دردناک چیخیں سنائی دے رہی ہیں" یہ کہتے ہوئے متری کا شہزادہ عروسی لباس میں گھوڑے پر سوار ہوا اور سرپٹ دوڑتا ہوا نظروں سے اوجھل ہو گیا شہر کی تمام مشعلیں بجھا دی گئیں۔ گلے میں پھولوں کا ہار سر پر مکٹ رکھے ہوئے شہزادہ میدان جنگ میں جا رہا تھا۔

دلہن کی ماں روتے ہوئے بولی "یہ سہاگ کا جوڑا اتار ڈال۔ اے بدقسمت لڑکی"

لیکن شہزادی نے جواب دیا "ماں اس کو رہنے دو۔ میں اپنے سوامی کو ڈھونڈنے متری کی راجدھانی جا رہی ہوں۔"

برہمنوں کی مسرت سے بھری ہوئی آشیرباد لے کر وہ رتھ میں سوار ہوئی۔ جب وہ متری کے محل کے پھاٹک پر پہنچی تو ہر طرف سے بھیانک چیخیں رات کی سیاہی میں سنائی دیں۔

"کون ہے؟ باجوں کو بند کرو ...... متری کا شہزادہ لڑائی میں سورگ باشی ہو گیا ہے"

شہزادی یہ سنتے ہی چونک پڑی وہ رتھ سے باہر نکل آئی اور بولی "بگل، بانسری اور نقاروں کو خوب بجاؤ ...... اب میرا بیاہ ہوگا ...... ہمارے جیون کی گرہ کبھی نہ کھلنے کے لئے اب پھر سے باندھی جائے گی" وہ شہزادہ کے پاس آئی جو ابھی عروسی جوڑے میں ملبوس چتا پر لیٹا ہوا تھا۔ شہزادی نے دولہا کے دامن سے گرہ لگائی اور اس کا سر اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا

"تم پر بھگوان کی دیا ہو!" پروہت نے متانت سے کہا "تم امر ہو گئیں" خوفناک اور بھڑکتے ہوئے شعلے کسی مہیب دیو کی زبان کی طرح چتا سے نکل رہے تھے۔ اور شادی پایۂ تکمیل کو پہونچ چکی تھی۔

شمیم ہاشمی لکھنوی

دو آتشہ

ازبمبئی　　　ازبمبئی

از محمد رابعکاری صاحب سندر

چل ہی گیا ہے تیر یہ تمنائے دید میں
جان امید گم ہے دل ناامید میں
وہ دامن شفق میں، نہ وہ ماہ عید میں
جو سرخ و شوخ رنگ ہے خون شہید میں
دست جنوں سے دامن صحرا نہ بچ سکا
چالاک کس قدر ہے یہ قطع و برید میں
اب کیا رکے گی وعدۂ فردا پہ تیرے بوٹ
جب چل گئی تو چل گئی یاس و امید میں
وہ خود چھپے ہیں تو چہرہ چھپا چھپا
کچھ تھی فراق ہی سے تیز دید میں
لاتقرب الصلوٰۃ ہے ابھی پیر درد نیش
کس درجہ اہتمام ہے کس کی کشید میں
کس دن تمام ہوں گے یہ دن انتظار کے
کب تک امیدوار رہیں گے امید میں
یہ ایک شعر جواب ہے حسن و شباب کا
عجلت نہ کیجئے مرے دل کی خرید میں
تم کو ہی کیوں بتائیں نہ اپنے تسلی کا چاند
وعدہ وفا کر دو کہ یہی شب ہے عید میں
میرے لئے تو پھر بھی ان کا وصال ہے
جو لطف ہے فریب میں وہ ہی بعید میں

(تاثرہ)

استاد کہنہ مشق بھی سندر تڑپ اٹھے
کیا خوب ہے غزل تری، رنگ جدید میں

از محترمہ فاتون صاحبہ

ہنگام ان کی، جواب بنے تمنائے دید میں
یعنی یہاں وہ آئیں گے، اب ماہ عید میں
وہ یہاں کہ بنفس رہتے ہیں، دل ناامید میں
آپ آگئے کہ لگ رہی ہے شوق دید میں
دل لے رہا ہے لطف، ترے درد عشق کا
اب مبتلا ہیں نعرۂ ہل من مزید میں
میری نگاہ شوق سے کیا چھپ سکو گے تم
جب جلوہ ہے میرے ہی سینے کی امید میں
وہ جان و دل سے ہیں سنتے ہیں حسرت و شنید میں
وہ بخت و بست رہ گئے اشارۂ نقاب میں
دونوں الجھ کے رہ گئے وعدہ و وعید میں
اس آرزو میں ہوں، قریب سے ہو دید
شیشہ تو ہوا، امتحان نگاہ بعید میں
اے دل وہ نظارہ، وہ ذکر محرم کا عید میں
اچھا نہیں ہے شعر تیرا، وصل کا وقت
تعبیر خواب ہے، اضطراب بعید میں
مستقبل قریب، شکرانہ ہے ان کا عید میں
وہ سامنے ہیں ان کے، تصور میں، عید میں
کیا مزہ ہے کہ جو خوشی ضبط ہو سکے
ممکن نہیں کہ وصال کی لذت وعید میں
ہے وعدہ وصال

(تاثرہ)

اُس انجمن میں اب کے حیا جان جائے گی
دل پہلے جا چکا ہے تمنائے دید میں

فنونِ لطیفہ

مولوی عتیق الحق کا پانچواں خطبہ +
تجاری۔ مصوری۔ موسیقی اور شاعری

مولوی عتیق الحق صاحب دکن کے سفر سے ابھی واپس ہوئے تھے۔ سانس تک بھی لینے نہیں پائے تھے کہ علیگڈھ سے خط پہ خط آنے شروع ہوئے۔ کالج میں سالانہ تقسیم انعام کا جلسہ ہے۔ آپ کی تشریف آوری ضروری ہے۔ بہت سے عذر بھی پیش کئے۔ تمارض بھی کیا۔ مگر کارگر نہیں ہوا۔ اُدہر سے اصرار ہوتا رہا۔ اور اصرار بھی کس کا سر سید کا۔ گو آپس میں چشمک تھی۔ مگر شریفانہ۔ ایک دوسرے کا احترام کرتا تھا لیاقت کا قائل تھا۔ اختلاف رائے کوئی بری بات نہیں۔ یہ ہوا ہی کرتا ہے۔ مولوی صاحب مجبور ہو گئے۔ وعدہ کر لیا۔ مضمون خطبہ فنونِ لطیفہ قرار پایا۔ اسٹیشن پر پہنچے تو سر سید مع اپنے حواریوں کے پیشوائی کو موجود تھے۔ بڑے تپاک سے اتروایا اور ساتھ گاڑی میں بٹھالے گئے اپنی کوٹھی میں اتارا۔ مہمان نوازی میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا۔ دوسرے دن جلسہ تھا۔ مولوی صاحب اور سر سید ساتھ ساتھ یونیورسٹی ہال میں داخل ہوئے۔ جلسہ کے اختتام پر مولوی صاحب سے خطبہ کو فرمایا۔ اس موقع پر تعارف کی ضرورت نہ تھی۔ بارہا مدرسۃ العلوم میں لکچر بازی کر چکے تھے۔ وہاں کا چوہا چوہا ان سے واقف تھا بعض ان کے ثنا خواں تھے۔ اور بعض خیالات کی مغائرت کی وجہ سے متنفر۔ ان کی سحر بیانی مقبول عام تھی۔

خطبہ
فنونِ لطیفہ

مولوی صاحب کھڑے ہوئے اور کھڑے ہوتے ہی فرمایا ؎

گرد و پیش ما ہمہ حسن است و نازاں بے خبر
قلب دانا چشم بینا، از خدا خواہم مگر

فنونِ لطیفہ چار ہیں۔ لطیف میں لطف یہ۔ چاروں مل کر بے ساختہ مصرع بن جاتے ہیں۔ لو سنو!

تجاری، مصوری، موسیقی، اور شاعری،

اچھا ان کو لطیفہ کا خطاب کیوں عطا ہوا۔ اور کس کی بارگاہ سے؟ کس کی بارگاہ سے! یہ تو صاف ہے۔ انسان کی ... کیوں کہا گیا۔ یہ بحث طلب امر ہے۔ لطیف کے معنی باریک کے بھی ہیں۔ دل پسند کے بھی۔ بتاؤ کونسے معنی یہاں چسپاں ہیں۔ دونوں۔ بھلا کیوں کر۔ دل پسند ہونا تو اظہر من الشمس ہے۔ اگر باریکی کی شان ان میں نہ ہو تو پھر ہیچ ہیں۔ ...

نگاہ سننے کو حساس کان۔ اور پیدا کرنے کو بے نظیر دماغ درکار ہے۔ اگر کان درست نہیں تو بھینس کے آگے بین بجایا کرو۔ وہ ٹس سے مس ہونے والی نہیں۔ ہم نے تو ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں۔ جن کا قول ہے۔ ان میں دھرا ہی کیا ہے۔ خواہ مخواہ تضیع اوقات ہے۔ میں تو یہ کہوں گا ان کی اوقات پر لعنت۔ ان کا جینا مرنا برابر ہے۔ میرے پیارے نوجوانو! اگر تم میں کوئی ایسا موجود ہو۔ تو بہتر ہے کہ وہ فوراً چلا جائے۔۔۔ میں تھوڑی انتظار کرتا ہوں۔

(تھوڑی دیر بعد) خدا کا شکر ہے کہ کوئی حال میں سے باہر جاتا ہوا مجھے دکھائی نہیں دیا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے۔ کہ ماشاء اللہ سب میرے اور فن لطیفہ کے قدر دان ہیں۔ لیجئے سر سید میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں آپ نے اچھا باغ لگایا ہے۔ جہاں کا ہر پودا نازک نہال ہے۔ الحمد للہ یہ بھی ہماری خوش قسمتی اور ترقی کی دلیل ہے۔ خیر یہ تو فضول باتیں ہیں اب اصل مطلب سنو۔

فنون لطیفہ کی آخری جڑ کیا ہے۔ جو یہ پیڑ ایسا پھلا پھولا۔ عالم گیر ہو گیا۔ جڑ اس کی طلب حسن پر ہے۔

حسن کہاں ہے۔ ہر چیز میں ہے۔ کائنات عالم کا کوئی ذرہ اس سے خالی نہیں ہے

برگ درختانِ سبز در نظر ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

بار ریہی بات ہے۔ دیدہ بینا اور گوش شنوا درکار۔ بیل پھول کیا حسن کے سرچشمہ نہیں۔ باغ بازی کیا آنکھوں میں کھبے نہیں جاتے نغمہ طیور مسکن قلب رنجور۔ صدائے آبشار فردوس گوش جسمِ بے رادحسن پنہاں۔ کروٹ کروٹ جنت جنا الجنتین دان ۔۔۔کی زمین بن جنتے سرسبز ہے۔ انسان نے آنکھ کھولی تو یہ نظارہ پیش نظر تھا۔ پھر حسن کا شیدائی کیسے نہ ہو جاتا۔ تقاضائے فطرت تھا۔ پیدا ہو رہا۔ یہی نہیں طبیعت میں صناعی بھی ودیعت کی گئی ہے۔ صانع حقیقی کی صنعت کا دلدادہ ہے۔ مگر خود بھی کچھ کرکے دکھانا چاہتا ہے۔ یہی جذبہ تھا جو فنون لطیفہ کا مورث ہوا۔ قدرتی آئینہ۔ یعنی آب مصفیٰ میں اپنا معائنہ کیا۔ ان کو سڈول اور خوشنما پایا۔ تناسب ہر چیز میں نظر آیا۔ اس سے تشفی نہیں ہوئی۔ اضافہ کرنے کو جی چاہا ہے

مشاطہ را بگو کہ براسباب حسن یار
چیزے فزوں کند کہ تماشا بما رسید

دست مشاطہ نے دست گیری کی۔ لباس اور زیور سامنے لاکر رکھدیا لباسکم بوادی سواتکم وا بشاتا اپنے کو سجایا۔ اپنی معشوقہ کو سجایا۔ وہ اس کو دیکھ کر خوش ہوئی۔ یہ اس کو دیکھ کر باغ باغ ہوا۔ وہ معشوق ہی کیا جس کو عاشق اپنے سے افضل نہ سمجھے۔ آنکھیں نظارہ یار کے لئے وقف ہیں۔ دل اس کے حسن وعشق کی جولان گاہ ہے۔ تجویز یہ قرار پائی۔ زینت ملبوس دونوں میں مشترک۔ زیور دل آرام کے لئے مخصوص۔ یہ صنعت میں حسن کی ابتداء ہے۔ انتہا لا انتہا ہے۔ چیز کی ابتدا کا پتہ چلا سکتے ہیں۔ انتہا زمانہ کی انتہا کے ساتھ وابستہ ہے۔

محبوبہ راہئ ملک عدم ہوئیں۔ عاشق مہجور دل تھام کر بیٹھ گیا۔ قبر کو اس کی نشانی قرار دی۔ اپنے لئے زیارت گاہ بنایا۔ قلب ۔۔۔ ڈھیر نے تسلی نہیں کی۔ کچھ زیادہ درکار تھا۔ مجسمہ کی سوجھی۔ حس وحرکت نہ سہی شبیہ تو ہوگی۔ شاید دل غم دیدہ بہل ۔۔۔ ٹھنڈی ہو۔ مٹی کی مورت بنا کر کھڑی کی۔ یہ ناپائدار۔ ایک بارش میں بہل بہی۔ ایک آندھی نے ڈھا دیا۔ ٹھیس لگی چکنا چور۔ کوئی ۔۔۔ دن قیام کی صورت نکلتی ہے۔ اب لکڑی اور پتھر کی سوجھی۔ نجاری اور حجاری کی بنیاد پڑی۔ پھر امتداد روزگار نے اس کو چوچار ۔۔۔ وہ محتاج بیان نہیں۔ عالم بازی گاہ ہے۔ ہر شخص سبقت کا جویا ہے۔ یہی خواہش ترقی کا بیج بوتی ہے۔ دیکھ لیجئے یہ فن کیا تھا اور کیا سے

گیا ہوگیا۔ ہندوستان کے جبت اور طاغوت پیش نظر ہیں۔ یہ اول مشق ہے۔ ایجاد کرنے والا ایجاد کرگیا۔ پھر آگے قدم نہ بڑھایا۔ مشقِ ثانی یونان کے دیوتا اور روما کے مجسمے ہیں۔ بس روح پھونکنے کی دیر ہے۔ پھر منہ سے بول اٹھیں۔ کاریگری کا یہ اندازہ ہوتا ہے۔ کاریگر کی روح کا صنعت مرقع ہوتی ہے۔ پاکیزہ کاریگر کے قالب میں پاک روح ہے۔ اس سے نکل کر اس کے کارناموں میں سرایت کرتی ہے۔ مصوری۔ حجاری کا شعبہ ہے۔ اصل میں دونوں ایک ہیں۔ اس میں دو بعد اس میں تین ابعاد۔ یہاں موزگار رنگ وہ بے رنگ بود دونوں میں مفقود۔ یہ کسی اور ہی کے قبضہ کی چیز ہے۔ انسان کے بس کا کام نہیں۔ اب چاہو رنگ پر مر مٹو۔ چاہو جسامت پر۔ اپنی اپنی آنکھ اپنا اپنا مذاق۔

اسلام آیا۔ مجسمہ سازی شعبہ بت پرستی قرار پایا۔ حرمت لازم آئی۔ مصوری بھی حرف غلط بن کر رہ گئی۔ مذہب ابراہیمی نے پہلے ہی یہ ڈول ڈالا تھا۔ بتانِ آذری سرنگوں ہوگئے۔ ہراغ علیہم بالیمین۔ جذبۂ حسن اس میدان میں بھی دبنے والا نہ تھا۔ دوسری طرف سر جا نکالا۔ خطاطی اور بیل بوٹوں نے اس کی جگہ سنبھالی۔ اس صنعت کو ارباب کمال نے مصوری اور حجاری سے افضل کر دکھایا۔ پھر سچ پوچھو تو دونوں رہا۔ یہ بھی جاری وہ بھی جاری۔ اسلام کے ضعف کے ساتھ خطاطی خط بطلان ہو کر رہ گئی۔ مصور نے مسلم اور غیر مسلم پر تسلط جما لیا۔

جیسے مصوری ویسے ہی معماری۔ دونوں حجاری کی شاخیں۔ تناسب معماری کی جان۔ یہ کائنات عالم میں بھی موجود ہے۔ مگر دیکھنے کو دیدہ وا ہونا چاہئے۔ نہیں تو غالب کی طرح یہ کہہ دیا جاتا "اگر ہمارے مشورے سے آسمان کو تاروں سے مزین کیا جاتا۔ تو ہم بیل بوٹے بناتے۔ زینا السمآء الدنیا بمصابیح۔ ذرا سوچو تو تناسب بغیر حسن نہیں پیدا ہو سکتا۔ حق سبحانہ کا قول ہے۔ خلقنا کل شیٔ موزون اب تناسب ہونا لازم۔ انکار کرو کیسے کرتے ہو۔ کیا خدا کے قول سے انکار کروگے۔ اپنی آنکھوں کا قصور ماننا پڑیگا۔

انسان حسن کا دلدادہ عمارتوں میں تناسب کا طالب ہوا۔ جس عمارت میں جتنا اندازہ صحیح رہا۔ اتنی ہی دل کش ہوگئی۔ تناسب پر صحیح قابو رکھنے والے دماغ کمیاب ہیں۔ قاعدے قانون یہاں نہیں چلتے۔ کہتے ہیں کہ الحمرا کے انجینیر نے کسی قاعدہ کی پابندی نہیں کی اور پھر بھی یہ قصر عجائب روزگار میں سے۔ یہی وجہ ہے کہ خوبصورت عمارتیں بہت کم ہیں۔ اور نئی تو تعمیر ہی نہیں ہوتیں۔ شاید یہ قوت دماغوں سے سلب ہوگئی ہے۔ یا سارا خزانہ اگلے لوٹ لے گئے۔

تہی خم خانہا کردند و رفتند

بہت ہاتھ پاؤں مارے جاتے ہیں۔ مگر مقصود تک رسائی نہیں ہوتی۔

سنا ہے۔ کہ جس نے پہلے عمارت بنائی۔ انسان کے چہرہ کا نقشہ اتارا۔ اس میں کچھ نہ کچھ راستی ہے۔ طاق ابرو ملاحظہ ہو۔ قدیم عمارتوں پر اس کا شبہ ضرور ہوتا ہے۔ ذرا دیکھیں تو انسان کی طبیعت تناسب کی طرف کیوں کر راغب ہوئی۔ نظارۂ قدرت کرتے کرتے کہیں دو غار یا دو پہاڑ۔ یکساں سے پاس پاس یا آمنے سامنے نظر پڑے۔ آنکھوں کو بہت بھلے معلوم ہوئے۔ خود دیکھے دوسروں کو دکھائے۔ اب جو بنانے بیٹھے تو اس کی پابندی کی۔ عمارت کے حسن کی پہلی منزل طے ہوگئی۔ آگے ترقی کے لئے راستہ کھلا ہوا تھا۔

آؤ ذرا موسیقی کی طرف متوجہ ہوں۔ یہ کیا ہے۔ موسیقی میں موسیقار کی کہانی۔ فکر بلند کی کہانی ہے۔ نغمۂ آبشار۔ زمزمۂ طیور۔ معشوقہ کی رسیلی سُریلی آوازیں۔ سب سنیں اور کانوں کو بھلی لگیں۔ خوش الحان پرندے پالے۔ آبشاروں کے پاس بیٹھے مزے اڑائے۔ دلربا کی آواز سنی دل کو تسکین دی۔

بابر، بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

یہ سب قدرت کے کرشمے تھے۔ انسانی ایجاد کو دخل نہیں۔ سہل الحصول بھی نہیں۔ ہمہ وقت موجود بھی نہیں۔ ایسی تدبیر ہونی چاہیئے کہ صوت دل کش کان میں گونجتی رہے۔ فرطِ شوق دامن گیر رہے۔ کچھ اضافہ بھی ہونا چاہیئے۔ لیجئے مضراب و تار آئے۔ آواز میں اتار، چڑھاؤ پیدا کیا گیا۔ کانوں نے کہا واہ۔ یہ تو قدرتی موسیقی سے بازی لے گیا۔ دوسرے اپنے ہاتھ کی بات جیت چاہو۔ بجایا کرو اور مزے اڑایا کرو۔ محفل سرود آراستہ ہونے لگی۔ خود بھی مزے لئے اور یاروں نے بھی مزے کئے۔ معشوقانِ جاں نواز بھی شریک محفل ہوئیں۔ چال پہلے ہی سے انوٹ کی تھی۔ آنکھیں دیکھ سکتی تھیں۔ کان اس لذت سے محروم تھے۔ اگر دونوں اس سے محظوظ ہوں تو کیسی رہے۔ کان کے واسطے صوت لازم۔ مشکل ہی کیا ہے۔ قدم کی آواز میں موزونیت پیدا کردو۔ زیر و بم پر قدم اٹھاؤ اور رکھو۔ یہاں بھی راگ موجود ہے مگر اتنا کمزور کہ کان تک رسائی معلوم! ایسا ہونا چاہیئے کہ کان متاثر ہوں۔ بھائی گھنگرو باندھ دو۔ قدم اٹھا اور تال میں تھا کانوں نے قبول، کر لیا۔ لطف آنے لگا۔ اب محض محفلِ رقص و سرود بن گئی۔ رقاصی فن ہو گیا۔ سکھایا جانے لگا۔ بوٹی بوٹی تال سر پر پھڑکنے لگی۔ یہ اور اضافہ ہے ہنر کی تکمیل ہو گئی۔ بعض قوموں کو گھنگرؤں کی نہیں سوجھی۔ یونہی تال سر پر جنبش کی۔ یہ بھی ناچ ٹھہرا۔ اس میں بھی حسن ہے۔ اگر وہ بہشت چشم و گوش تھی۔ تو یہ بہشت چشم ہی سہی۔

ساز کی آواز دلپذیر لاریب۔ مگر انسان اور خصوصاً پری پیکر معشوق کی میٹھی میٹھی صدائیں دل کش تھیں۔ یوں تو ہر بول پر جانِ عاشق، قربان تھی۔ مگر کان یہاں بھی سر کے طالب ہوئے۔ بات ہی کیا تھی حنجرہ میں آٹھوں سر کے تار موجود۔ بس مشق و ریاضت کی دیر تھی۔ سارے باجے کے سر نکال لئے۔ کانوں کی اب بھی تشفی نہیں ہوئی۔ دل کچھ اور چاہتا ہے۔ یہاں ھل من مزید کی بے بسی ہوئی ہے۔ کیا خوب ہو جو یہ سر باجے کے سروں سے ملجائیں۔ اُدھر باجا بجے اِدھر گاتا ہو۔ جوبن دو بالا ہو جائے۔ خیال آنے کی دیر تھی۔ سب تیار رکھا تھا۔ قدرت نے اس پر بھی دست قدرت دیدیا۔ اب محفلیں سُر و سرود و سوز کی ہنگامہ بنیں۔ یہ تو بزم کا ذکر ہے۔ اب رزم کی سنئے۔ جب بزم میں موسیقی مست کر دیتی ہے۔ پھر کیا رزم اس اثر سے مستثنیٰ رہے گی۔ یہاں اگر عیش نشاط میں توفیر ہوتی ہے تو وہاں تہوّر و شجاعت میں امداد۔ بات یہی ہے۔ بزم گاہ سے موسیقی نے رزم گاہ میں قدم رکھا۔ صنفِ نازک پر داخلہ بند تھا۔ وہ نازک نازنین دل تو یہ خونی منظر دیکھ کر دہل جائیں گے۔ ان کو تو محلوں اور خیموں ہی میں آرام کرنے دو۔ یہاں تو جو کام لینا ہے۔ ساز سے لو۔ نہیں تو ہلچل پڑ جائیگی۔ بہادری دہادری سب ملیامیٹ۔ طبع بشر کے موافق تھا۔ یونہی عمل میں آیا۔

اور دیکھو شیر تمام جانوروں میں سب سے شجاع جانور کہا جاتا ہے نکلتا ہے تو ڈکارتا ہوا۔ آخر کیوں۔ اس لئے کہ سارے چرند و پرند دہل جائیں۔ اور جان لیں کہ خود بدولت تشریف لاتے ہیں۔ جہاں بن پڑے چھپ بیٹھو نہیں تو ڈکار جائیں گے۔ کیا ہم شجاعت و مردانگی میں شیر سے کم ہیں۔ جب میدانِ جنگ و جدال میں برآمد ہوں تو کیوں نہ ڈکاریں۔ اور دشمن کا زہرہ پانی پانی کیوں نہ کر دیں۔ مگر ڈکاریں تو کیونکر ڈکاریں۔ اللہ میاں نے ایسی آواز ہی عطا نہیں فرمائی۔ نہیں دی نہ سہی۔ عقل تو دی ہے۔ بڑے بڑے ڈھول دمامے بناؤ۔ جب چوب پڑے گی تو ہمارے بدلے وہ ڈکاریں گے۔ یوم العباس بھی قیامت صغریٰ ہے۔ لاؤ ہم بھی قرنا و بوق بجائیں۔ پڑھ لو نقر فی الناقور اگرچہ اس کو موسیقی سے بہت دور کا تعلق ہے۔ تاہم صوت تو ایک ہی ہے۔ اس لئے ذکر ضرور تھا۔

اب ذرا زبان کا حال سنئے۔ سیدھے سادے چلے بستے بولتے جی اکتا گیا۔ جی میں آیا کہ ان میں بھی گل بوٹے لگیں۔ وہی حسن کی چاٹ اور موزونیت کا لپکا۔ چین کب لینے دیتا تھا۔ نثر میں وہ وہ موشگافیاں ہوئیں کہ عیاذاً باللہ چیستاں بنکر رہ گئی۔ مطلب سارا خبط الفاظ کی بھرمار۔ نکتے کے اندر نکتہ۔ یہ حسن میں غلو کی انتہا ہے۔ غلو ہر جگہ برا ہے۔ خیر الامور اوسطہا۔

نظم دوسری چیز ہے۔ وہ موسیقی کی سہیلی ہے۔ جب ساز کے ساتھ بول الاپے جائیں اور ان میں اگر وزن موسیقی نہ ہو تو گلا چل ہی نہیں سکتا۔ سرگم ساتھ ہی نہیں دیتی۔ وزن موسیقی ساز ہی کے ساتھ زیبا ہے۔ یا کم سے کم الاپ کے ساتھ بغیر اس کے ناموزوں اور بیڈول

کان قبول نہیں کرتے۔ وزن حقیقی کی تلاش ہوئی۔ شعراء پیدا ہوئے۔ اور اس صنعت کو آسمان پر لے اڑے۔ رنگ آمیزی کی حد باقی نہ چھوڑی؛ سانپ تو نکل گیا۔ کینچلی چھوڑ گیا۔ شعر معمہ بن کر رہ گئے۔ جذبات کی ترجمانی ان کا فرض تھا۔ ان کی خود ترجمانی کرنی پڑی۔ تحسین اور تبرید کی بہتات کا یہ نتیجہ ہوتا ہے۔ ہر مقام پر تنا سب کا خیال مقدم ہے۔ ہم عصروں کی بد مذاقی دلیل راہ بنکر غول بیابانی کا کام کرتی ہے۔ جب ہوش آتا ہے۔ تو ندامت کا سامنا ہوتا ہے۔ وقت نکل گیا۔ ع

گیا ہے سانپ نکل، اب لکیر پیٹا کر

اس قصہ کو چھوڑیئے۔ فنون لطیفہ پر نظر ڈالیئے اصل مقصد پر آیئے۔ لیجئے ایک عمدہ عمارت تعمیر ہوئی۔ حسن میں بے نظیر۔ دور دور سے دنیا دیکھنے کو چلی آ رہی ہے۔ یہاں آ کر کیا لیا۔ یہ تو غیر کی ملک ہے۔ قیام تو کر نہیں سکتے۔ ہاں گھنٹہ دو گھنٹہ مالک کی اجازت سے آنکھیں سینک لو۔ اگر پہلو میں دل رکھتے ہو۔ تو ماڈُ تاج گنج جا کر دیکھ لو۔ محو حیرت نہ کر دے تو سہی۔ سب غم و الم دور مسرت طاری وساری دل کی خواہش ہے کہ آنکھ نہ اٹھنے پائے۔ آنکھ کہتی ہے کہ آج میرے بھر پائے ہوئے۔ ملاحظہ ہو یہ فن لطیف اور یہ اس کی شان۔ راگ رنگ اور شاعری سب ایک تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ سب میں ایک روح ہے۔ ایک دل آویزی۔

اب دوسرا اثر لیجئے۔ یہ کسی نہ کسی قوم کے کارنامے ہیں۔ دوسری قوم دیکھتی یا سنتی ہے۔ کیا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ عظمت اور محبت اگر اللہ والے ہیں تو دعائے خیر۔ مذہب اور قوم کی تفریق اٹھ جاتی ہے۔ الفت جو زندگی کا ما حصل ہے۔ سینہ کو لبریز کر دیتی ہے۔ کیوں بھائی فنون لطیفہ کا یہ احسان کچھ کم ہے۔ مغائرت دور ہوئی۔ یگانگت پیدا ہو گئی۔ یہ تہذیب اور شائستگی کے معیار ہیں۔ تہذیب میں آئین اور گئیں مگر یہ، با برجا رہے۔ ان کے فقدان جہالت کا مرادف۔ ان کا وجود کمال ظاہری اور باطنی کا ثبوت۔

صنعت کو حقیقت پر فوقیت نہیں ہے

ہر چند کہ صنعت سے، بنائے کوئی، ناقہ،
پہنچے گا نہ وہ، ناقۂ آہوئے ختن کو

قدرت کی کاریگریاں ہم دیکھتے ہیں۔ اور آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ صنعت کو دیکھتے ہیں اور آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جاتی ہیں۔ اس کی وجہ۔ یہ ہم ہیں۔ وہ ہم نہیں۔ اپنی قابلیت پر کرشمے ناز کر رہے ہیں۔ حسن قدرت سے روگردانی ہے۔ یہ ہمارا کام نہیں۔ کسی اور طاقت کا کام ہے۔ ہم تو اپنے کارناموں کے شیدائی ہیں۔ اللہ میاں کے کارنامے دیکھتے دیکھتے تو آنکھیں چندھیا گئیں۔ اب ان کو کیا دیکھیں۔ نہ دیکھو آنکھیں بند کر لو۔ مگر یہ حقیقت سے آنکھیں بند کرنی ہوں گی۔ تمہارے کارناموں میں کیا دھرا ہوا ہے۔ ان میں وہ وسعت اور تنوع ہی کہاں۔ یہ تو گڑیوں کے کھیل ہیں۔ مگر انسان ضعیف النسیان انہی پر فخر کرتا ہے۔ کرنے دو۔ عالم تماشہ گاہ ہے۔ تماشہ کرو اور چلدو۔ لو ہم بھی چلدئے

صبح دمید و شب گذشت، ماہ شبینہ خانہ رفت
روئے سحر سیاہ کنید، یار بدیں بہانہ رفت

(خواجہ) عبد المجید بی اے

طاقِ کسریٰ

حضرتِ ناز آتش حیدری دہلوی مقیم بغداد

طاقِ کسریٰ یہ قدامت، یہ بلندی تیری
اس قدر عمر پہ یہ اوج پسندی تیری

دور پاتا ہے درِ شام و سحر سے تجھ کو
آسماں دیکھتا ہے نیچی نظر سے تجھ کو

چشمِ ایراں سے تو دیکھے کوئی عظمت تیری
تمغۂ عدل، زمانے میں ہے رفعت تیری

کھل گئی امن کی دستارِ فضیلت تجھ پر
ناز کرتی ہے، ترازوئے عدالت، تجھ پر

اس بلندی پہ بھی پستی میں تجھے پاتا ہوں
داستاں عظمتِ اسلام کی دہراتا ہوں

وہی اسلام جو صحرا کی ہوا میں، پھولا
وہ گلستان جو صداقت کی فضا میں پھولا

ہے تری کرسئ انصاف پہ جس کا انصاف
جس[1] کی ہیبت نے کیا سینۂ دریا میں شگاف

ہر طرف دامنِ توحید نے ڈالا، سایا
آسماں کانپ اٹھا، مہر کو چکر آیا

جس کی بنیاد نے، بنیاد ہلا دی، تیری
کنگرے توڑ دئے، خاک اڑا دی، تیری

دہنِ وا کی طرح رہ گئے کمرے تیرے
آج تک دیدۂ حیراں ہیں دریچے تیرے

وقت پر تیرے مدبّر کی، نہ تدبیر چلی
گردنِ کفر پہ اسلام کی شمشیر چلی

---

[1] حضرت عمرؓ کے عہد کا ایک تاریخی واقعہ ہے۔ جب طاق کسریٰ فتح ہوا۔

ادب میں فرقہ پرستی

ملک کے مشہور ادیب و شاعر گوری سرن لال صاحب سنبل۔ ایم، اے اردو دوستی اور رواداری کے لحاظ سے ہر طبقے میں ہردلعزیز ہیں۔ بایں ہمہ ذیل کا مضمون فرقہ وارانہ رنگ آمیزی سے خالی نہیں۔ لب ولہجہ بھی کسی قدر درشت اور سخت ہے۔ مگر اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ موصوف کی نیّت خدانخواستہ بری ہے۔ بلکہ اردو دوستی کا جذبہ اس قدر حد سے تجاوز کر گیا ہے۔ کہ بعض طعن اور جلی کٹی باتیں کہنی پڑیں۔ پھر بھی بہت سے جملے اور چند واقعات قابل گرفت اور جواب طلب ہیں۔

میرے شفیق دوست سنبل صاحب مجھے معاف فرمائیں کہ اکثر جگہ میں نے ان کے اعتراضات اور غلط فہمیوں کا حاشیئے پر حقائق کی روشنی میں ازالہ کر دیا ہے۔ اکثر ایسی باتیں نظر انداز کر دی گئیں ہیں جو چھوٹی چھوٹی اور ان کی شان کے شایاں نہیں۔

(شہابؔ)

دنیا کے کسی ادب میں اس قدر "تو تو میں میں" کبھی نہ ہوئی جتنی اس وقت ہندوستان میں اردو ہندی کے مسئلہ پر ہو رہی ہے۔ مانا کہ انگریزی ادب میں یہودیوں پر جا بجا حملے کئے گئے۔ اور انہیں بدترین خلائق ثابت کرنے کی کوشش کی گئی۔ اور یہی حال یورپ کے [illegible] ہے۔ لیکن ہندوستان میں تو فرقہ پرستی الٹریچر کا جز بن کر رہ گئی ہے۔ جس ملک میں جو تحریک جاری رہتی ہے اس کا اثر [illegible] فنون پر [illegible]۔ ہندوستان میں سب مسئلوں کا مسئلہ فرقہ وارانہ سوال ہے جسے حل کرنے کے لئے فی الحال کوئی صورت نظر نہ [illegible] مختلف جماعتیں اور باہم نبرد آزمائی کرنے والے فرقے ہر ملک کی تاریخ میں نظر آتے ہیں۔ مگر ہندوستان میں فرقہ پرستی اس [illegible] ہے [illegible] سے چھوٹی [illegible] تعصب سے دیکھی جاتی ہیں۔ چنانچہ ادب پر بھی اس کا اثر پڑا ہے۔ جب سے ہندوؤں کی [illegible] ہوئی ہے۔ یہ مسئلہ اور بھی [illegible] پڑ گیا ہے۔ گزشتہ صدی کی ابتدا میں ہندو قوم کے مردہ قالب میں نئی [illegible] حس و حرکت پیدا ہوئی تو [illegible] یک جاگی۔ تمدنی اصلاحات شروع ہوئے۔ تعلیم عام ہوئی [illegible] کوششیں ہونے لگیں [illegible] تحریک کا اثر تھا کہ عربی، فارسی سے ہندو دامن بچانے لگے [illegible] سنسکرت الفاظ سے بھرنے لگے کہ وہ اردو [illegible] ایک [illegible] اسی طرح ہندو اور مسلمان ایک دوسرے سے بیگانہ [illegible] جب مسلمانوں سے کیا جاتا ہے۔ تو وہ [illegible] ...... استعجاب سے [illegible] ہو گئے ہیں [illegible]

[illegible]

تعبیر کرتے ہیں۔ ستم تو یہ ہے کہ اگر ہندو مسلمان ایک دوسرے سے مل سکتے ہیں اور باتیں کر سکتے ہیں تو انگریزی وضع لباس میں ان کی باتیں انگریزی[1] لباس میں ہوتی ہیں۔ اور انگریزی ماحول کی نسبت۔

زبان کا مسئلہ جہاں تک ہمیں معلوم ہے سوا ہندوستان کے کسی اور ملک میں فرقہ دارانہ رنگ نہیں پکڑ سکا۔ تحریر اور تقریر دونوں ذرائع سے۔ ہندو مسلمان اپنے اپنے ادب[2] کی اشاعت کر رہے ہیں۔ جن کے پاس زیادہ سے زیادہ دولت ہے۔ وہ زیادہ کتابیں چھپوا سکتے ہیں۔ انہیں یہ آسانی بھی حاصل ہے۔ کہ چھوٹی چھوٹی کتابیں چھپوا کر گاؤں گاؤں مفت تقسیم کریں۔ جن کے پاس صوبوں کی حکومت ہے۔ وہ جو زبان چاہیں پھیلائیں۔ مگر وہ کیا چاہیں یہ ان کے بس کی بات نہیں ہے۔ کیونکہ انہیں رائے عامہ پر چلنا ہے۔

اردو میں "انجمن ترقی اردو" اور ہندی میں "ناگری پرچارنی سبھا" فرقہ پرستی کی علمبردار ہیں۔ دونوں ہندوستانی کی مخالف ہیں۔ ایک ہندی کی مذمت کرتی ہے دوسری اردو کی۔ دونوں مفید ادبی کام کرتی ہیں۔ لیکن جس قدر ان کا علم وسیع ہوتا جاتا ہے۔ اسی قدر ایک دوسرے سے کھنچتے جا رہے ہیں۔ ایک کہتی ہے اردو سے ہندوؤں کو دور کیا گیا۔ دوسری کہتی ہے ہندی سے مسلمانوں کو دور کیا گیا۔ دونوں غلط کہتی ہیں۔ جب اردو ہندی کا فرق ہی نہ تھا۔ تو پھر اردو لکھنے والے مسلمان اور ہندی لکھنے والے ہندو کیسے ہوئے۔

لیکن ادھر مسلمان ضرورت سے زیادہ فرقہ پرستی کی طرف مائل ہو گئے۔ جس کے جواب میں ہندو بھی فرقہ پرست ہوتے جاتے ہیں۔ مہاتما گاندھی کی نسبت ہزاروں صفحات دو تین سال کے عرصہ میں تحریر کئے جا چکے ہیں۔ ایک ایک لفظ میں مہاتما جی کی بلند شخصیت کو فرقہ پرستی کی کیچڑ میں سلنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مہاتما گاندھی ناگری رسم الخط پڑھنے کو آسان سمجھتے ہیں۔ یہی ان کا جرم ہے جس کی بدولت اردو کے تمام اخبارات اور رسالے ان پر لعنت کی بوچھاڑ کرتے ہیں۔ مگر اب تک کوئی یہ نہ ثابت کر سکا کہ گاندھی جی اردو کے دشمن ہیں۔ انہوں نے اپنی ہر ہر تحریر میں لکھا ہے۔ کہ اردو سے ہندی ... کو بہت فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

دار الترجمہ کی مطبوعات ان کی نظر میں قابل وقعت ہیں سب جانتے ہیں کہ کبھی مولانا ابوالکلام آزاد ... کی ... معرب تقریر پر کبھی کسی ہندو نے اعتراض نہیں کیا۔ اب وہ خود آسان زبان میں تقریر کرنے لگے ہیں کیونکہ ان کے سامعین عام لوگ ہوتے ہیں۔ اسی طرح جواہر لال نہرو کو بھی ہدف ملامت بنایا گیا۔ حالانکہ اس مسئلہ پر کوئی رائے نہیں رکھتے۔ ان کی تحریریں اور تقریریں بہت کچھ اس مسئلے پر روشنی ڈالتی ہیں۔ اور ان کا ایک مجموعہ بھی شائع ہو گیا ہے۔ پھر بھی انہیں اردو کا دشمن قرار دیا جاتا ہے۔ سبھاش چندر بوس نے رومن رسم خط کی حمایت کی تو اس وجہ سے اردو والے ان سے ناراض ہو گئے۔ اور انہیں سخت متعصب کہا۔ مالوی جی کی تقریریں سنسکرت آمیز زبان میں ہوتی ہیں۔ یہ وجہ مسلمانوں کی برہمی کی ہے۔ اتنی سی بات پر متنبہ کیا جاتا ہے کہ ہندوؤں سے ہوشیار رہو۔ ڈاکٹر تارا چند نے ہندوستانی آکاڈیمی کی جو رپورٹ لکھی اس میں چند سنسکرت کے الفاظ تھے اس وجہ سے انہیں ہدف ملامت بنایا گیا۔ مسٹر سمپورنانند ہندی کے اچھے مصنفوں میں سے ہیں ان کی زبان پر اعتراض کرنا اردو والوں کی ناانصافی ہے۔ اور کسی کا تو کیا ذکر پریم چند جیسے روشن خیال انشاء پرداز پر بھی اردو دشمنی کا الزام لگایا جاتا ہے۔ پریم چند ہندی میں لکھتے تھے۔ یہ کونسا گناہ تھا پھر بھی ایک صاحب قلم نے لکھا تھا کہ

۱؎ یہ الزام غلط ہے۔ جب ہندو مسلم پر انگریزی کا بھوت سوار ہوتا ہے۔ تو بھائی بھائی اور باپ بیٹے بلکہ گھر کی عورتوں تک سے سب انگریزی میں بات کرتے ہیں۔ صرف ہندو مسلم ہی ایسے ہیں جو ہر جگہ اردو بولتے ہیں۔ اور معاملات طے کرتے ہیں۔ (شہاب)

۲؎ ہندو مسلم کا صرف ایک ادب ہے۔ اور وہ ادب اردو ہے۔ جو دونوں کو مشترکہ ورثہ میں ملا ہے۔ جس کی تقسیم کبھی عمل میں آ ہی نہیں سکتی (شہاب)

۳؎ اس آسانی نے تو دونوں قوموں کو انتہائی مشکل میں پھنسا دیا ہے۔ اور اب مہاتما جی تو اس میں ٹانگ ڈال کر بالو کی طرح اکڑے ہیں۔ کیا اس سے بھی زیادہ اردو دشمنی کا ثبوت ہو سکتا ہے؟ (شہاب)

"وہ جس کا کھاتے ہیں اسی کا راگ گاتے ہیں" مطلب یہ تھا کہ ذریعہ معاش ہندی تھی۔ اس وجہ سے وہ نہ صرف اس کی حمایت کرتے بلکہ اردو سے بیر رکھتے تھے۔

گڑے ہوئے مردے کون اکھیڑے۔ لیکن ابھی چکبست اور شرر کی ناخوشگوار قلمی جنگ کون بھولا ہے نسیم[1] مرحوم پر جو الزامات لگائے گئے انہیں یاد کر کے تکلیف ہوتی ہے۔ نظر لکھنوی ایسے ماہر فن پر شوق قدوائی[2] مرحوم کی پھبتی کہ "پربھا کا شاعر اردو کیا جانے" ؟ کس سے سہی جائیگی۔ اسی طرح سرشار کی بھی مٹی پلید کی گئی۔ پھر کس طرح کوئی اردو کی خدمت کرے۔ جب ان مقدس اور قابل پرستش ہستیوں کو یہ صلہ ملا تو عام لکھنے والے کس شمار میں ہیں (عزیز لکھنوی مرحوم کا مکان منشی دوارکا پرشاد افق کے گھر سے چند قدم کے فاصلہ پر ہے۔ عزیز صاحب سے ان کا ذکر کیا گیا۔ تو پوچھا کون افق صاحب حالانکہ افق صاحب کو جاننے والے سارے ہندوستان میں ہیں)[3]

مسلمان نقادوں میں ایک بہت بڑی خرابی یہ ہے۔ کہ ہندو مصنفین پر کچھ لکھنا ننگ سمجھتے ہیں[4]۔ سرشار اور چکبست ایسے چوٹی کے مصنفین پر اب تک کوئی اچھا مقالہ نہیں لکھا گیا۔ ہندو رسالوں۔ اور اخبار کی بدولت بعض ہندو شاعروں کا قوم سے تعارف ہوگیا ہے۔ ورنہ وہ بھی گمنامی کی زندگی بسر کر کے مرجاتے۔ (سرشار۔ چکبست اور تسبل الہ آبادی کی شہرت زیادہ تر ہندی[5] جرائد کی بدولت ہوئی ہے۔) پنڈت[6] برج موہن دتاتریہ کیفی۔ لالہ سری رام دہلوی مرحوم اور مسٹر رام بابو سکسینہ سے زیادہ کس مسلمان نے اردو کی زیادہ خدمت کی ہے۔ لیکن انہیں اردو دنیا میں اتنی شہرت بھی نصیب نہیں ہے جس قدر عظیم بیگ چغتائی، ایم اسلم۔ اور ظفر قریشی وغیرہ حضرات کو ہے۔ بھلا بتائیے اب بھی لٹریچر میں فرقہ پرستی کا رنگ نہ آئے تو کیا ہو۔

---

[1] تعجب ہے کہ نسیم پر شرر کا الزام تو یاد رہا ورنسیم کی حمایت میں تمام ہندوستان کے شاعروں اور ادیبوں کی تحریریں اور زور قلم یکقلم فراموش ہوگیا بالخصوص سجاد حسین آنند دو بینچ جنہوں نے نسیم پرستی میں شرر کی وہ ہوا خیزی کی کہ بیچارے کی وطنی بنیادیں بھی اکھڑ چلیں۔ ابھی تو معرکۂ شرر و چکبست کے صفحات کتب خانوں اور لائبریریوں میں محفوظ ہیں پھر مطالعہ کیجئے (شہاب)

[2] شاعروں میں ایسی باتیں بالکل عام ہیں۔ بغیر کسی ہندو مسلم تخصیص کے ہر پڑھا لکھا جانتا ہے کہ ایک پیشہ ور اپنے دوسرے پیشہ ور پر اس سے زیادہ طعن کرتا رہتا ہے۔ میر و سودا، مصحفی و انشا، آتش و ناسخ۔ کے حالات شاہد ہیں۔ اس قسم کی باتوں کو اہمیت دینا۔ فرقہ وارانہ آگ کو اور بھڑکانا ہے۔ (شہاب)

[3] اول تو یہ واقعہ تصدیق طلب ہے۔ دوسرے تجاہل عارفانہ انسانی خاصہ ہے۔ اگر ایسا ہوا بھی تھا تو افق صاحب کی شخصیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا بلکہ اس تجاہل سے عزیز صاحب نے اپنے ہم چشموں میں افق صاحب کو ایک خاص اہمیت دیدی۔ (شہاب)

[4] سنبل صاحب تاؤ پیچ نہ کھائیے۔ یہ حضرات چوٹی ہی کے مانے گئے ہیں۔ اور بڑے بڑے مصنفین نے اکثر ان کی طرفداری میں دوسرے مسلمانوں کے خلاف بے حد موشگافیاں کیں ہیں۔ آپ کتب اور اخبارات و رسائل بغور مطالعہ فرمائیں گے تو سرمو فرق نہ ملے گا۔ (شہاب)

[5] آج چار دن سے ہندی کے دو تین جرائد نظر آرہے ہیں۔ مگر آپ ہیں کہ آنکھوں میں دھول جھونکے جاتے ہیں۔ ہندوؤں میں فی ہزار ایک بھی ان ہندو مصنفین کو نہیں جانتا یہ صرف مسلم صحافت کی برکت ہے کہ مسلمانوں کا بچہ بچہ سرشار اور چکبست کے علم و فن سے آگاہی رکھتا ہے۔ رہے تسبل الہ آبادی تو ان سے بہتر بہتر مسلمان شاعر کس مپرسی اور گمنامی کے ہاتھوں ہلاک ہو رہے ہیں۔ اس کے کیا معنی کہ چھوٹے سے چھوٹے آدمی کو بھی بڑائیں ذرا انصاف شرط ہے۔ حالانکہ مسلمان ایسا ہی کرتے ہیں جس کا تجربہ آپ کو بھی ہے۔ (شہاب)

[6] پنڈت جی کا احترام اور ادبی خدمات کا اعتراف ہر مسلمان کے لب و دہن پر ہے۔ لالہ سری رام آنجہانی اور بابو سکسینہ کے علمی و ادبی کارنامے رہتی دنیا تک تاریخ ادب میں سنہری حروف سے لکھے جائیں گے۔ اسی طرح تمام مسلمانوں کے دلوں پر بھی ان برسہ بزرگان ادب کے کلہائے نمایاں نقش کالحجر ہیں۔ ممکن ہے آپ اس کے برخلاف سمجھتے ہوں اور اپنا الزام مسلمانوں پر تھوپنے کی کوشش کی ہو رہے عظیم بیگ چغتائی (بقیہ صفحہ ۴۵)

دلی کے دو شاعروں کو لیجئے۔ نواب سراج الدین خاں سائل اور پنڈت امرناتھ ساحر دونوں بزرگ ہیں۔ ایک ساتھ کے کھیلے۔ ایک صحبت میں بیٹھنے والے۔ دونوں ماہرِ فن مشّاق۔ ساحر صاحب نے سینکڑوں مشاعرے کرائے اور ذوقِ ادب کو عام کیا۔ پھر بھی اردو میں انہیں اس کی چوتھائی شہرت بھی نصیب نہ ہو سکی۔ جو سائل صاحب کو حاصل ہے۔ یہ مسئلہ اردو والوں کے غور و فکر کا مستحق ہے۔ ہندی میں لے دے کے محض دو چار مسلمان لکھنے والے ہوئے ہیں۔ پھر بھی انہیں وہی مرتبہ حاصل ہے جو ان کی ٹکر کے ہندو انشا پردازوں کو۔ بہت سے ہندو اردو کے ساتھ ساتھ ہندی سے بھی واقف ہیں۔ انہیں بلا وجہ اردو کا مخالف سمجھا جاتا ہے۔ ہندی کی ترقی کی وجہ سے بہت سے ہندو جن کی زبان اردو تھی۔ اب ہندی بھی سیکھ گئے ہیں۔ اس طرح ان کی تحریر دونوں زبانیں جاننے کی وجہ سے۔ زیادہ شگفتہ ہوتی ہے۔ پھر بھی ان پر شک کیا جاتا ہے۔ مجبوراً وہ اپنی اولاد کو خالص ہندی کی تعلیم دیتے ہیں۔ خدانخواستہ چند برسوں کے بعد وہ زمانہ آئے گا جب ہندو اپنے بزرگوں کے لکھے ہوئے خطوط بھی نہ پڑھ سکیں گے۔

ہندوؤں کی تصانیف زیادہ قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھی جاتیں۔ بہت سے اردو لکھنے والے ہندوؤں نے اسی وجہ سے اردو کو خیرباد کہا۔ اور ہندی کے سایہ میں پناہ لی۔ ان کی کتابیں خریداروں کے معیار سے گری ہوئی سمجھی جاتی ہیں۔ پھر ہندو کس لئے اردو لکھیں۔

اردو کے کانگریسی اخبارات میں خواہ مخواہ زبان کی بحث چھیڑی جاتی ہے۔ اور مسلمانوں کو ہندوؤں سے بدگمان کیا جاتا ہے۔ ہندی پڑھنا ہندوؤں کا مذہبی فرض نہیں۔ لیکن اردو پڑھنا بھی مسلمانوں کا مذہبی یا شرعی فرض نہیں ہے۔ پھر مذہب کے نام پر ادب میں کیوں کیچڑ اچھالی جاتی ہے۔ پنجاب کے اخبارات خاص طور پر اردو کی حمایت کرتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہندو اسے مٹانے کی کوشش میں ہیں۔ اس وقت اور بھی افسوس ہوتا ہے۔ جب یہ بوچھاڑ ان لوگوں کی طرف سے ہوتی ہے۔ جو خود اردو سے واقف نہیں اور جنہوں نے اردو کی کبھی کوئی خدمت نہیں کی۔ اردو کو مشترکہ زبان بنانے کے لئے ضروری ہے کہ اردو کے محقق ان مصنفوں اور ان تصانیف کا پتا لگائیں جنہیں ادب میں کوئی مرتبہ نہیں دیا گیا۔ ہندوؤں کی بہت سی نظم و نثر کی کتابیں اب بھی موجود ہیں جنہیں اعلیٰ سے اعلیٰ مسلمان اپنا سکتا ہے۔ مسلمانوں کو چاہیئے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیں۔ اور اردو زبان کی تاریخ پھر سے لکھی جائے۔ اور اس میں تلسی داس۔ سور داس

(بقیہ سلہ صفحہ ۲۴) وغیرہ تو ظاہر ہے کہ یہ تینوں حضرات افسانہ نگار اور مزاحیہ نویس ہیں ان کا مذاقِ نگارش ان بزرگوں سے مختلف ہے۔ دلی خصوصیت ہے اور وہ مورخ ہیں۔ یہاں عام و خاص مذاق دونوں سموئے ہوئے ہیں۔ اسی لحاظ سے عام پسند بھی ہیں۔ اور ہنگامی دلچسپی کا مشغلہ بھی۔ سب جانتے ہیں کہ افسانے اور مزاحیہ مضمون کوئی ٹھوس اور تعمیری نہیں ہوتے۔ اسی سبب سے عام طبقہ ان کو پسند کرتا ہے۔ اور ہر کم علم بھی ان سے کچھ نہ کچھ لطف اندوز ہوتا ہے۔ متذکرہ بالا تینوں حضرات اپنی اپنی کارکردگی کے لحاظ سے طبقۂ اول میں شمار کئے جاتے ہیں۔ اس وجہ سے ان کا ذکر خیر اور ان کی داد و ستایش اونچے لوگوں کے لب و دہن پر ہے۔ جس قدر آپ بلند ہو کر اردو ادب میں ان بزرگوں کو دیکھیں گے۔ اسی قدر اردو مصنفین کی بلند صف میں نظر آئیں گے۔ ان تینوں ذی مرتبہ حضرات کے متعلق آپ خود صحیح رائے نہیں رکھتے۔ کسی آئندہ اشاعت میں ان پر ایک مفصل مضمون لکھ کر آپ کو بتا دوں گا کہ یہ مسلمانوں کے دلوں میں کس قدر گھر کئے ہوئے ہیں۔ اور ان کا کیا مرتبہ ہے۔ (شہاب)

سلہ جب سائل صاحب کے متعلق ملک میں یہ مشہور ہے کہ وہ شاعر کم ہیں مگر نواب و خوش گو زیادہ پھر ملک یہ بھی جانتا ہے کہ داغ مرحوم کی شاگردی اور دامادی کے بھی دو تمغے حاصل ہیں۔ علاوہ ازیں ملک کے اکثر و بیشتر حصوں میں سائل صاحب نے دورہ بھی کیا ہے۔ پھر بتائیے ملک کیوں نہ انہیں جانتا اور پہچانتا۔ رہے ساحر صاحب انہیں ان چار خصوصیات میں سے ایک بھی حاصل نہیں۔ ان کی خدمات ادب اور شاعری کا احترام سب جانتے ہیں کرتے ہیں۔ اور ضرورت سے زیادہ کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہر مشاعرہ کی صدارت کا قرعۂ فال انہی کے نام نکلتا ہے۔ اور کیا چاہیئے۔ (شہاب)

اگر پاکستانی اسکیم کامیاب ہو گئی۔ تو ضرور ایسا ہوگا۔ اور پاکستان اسکیم بھی آپ کے اسی جذبے سے وجود میں آئی ہے۔ (شہاب)

بہاری کیشو داس اور گوپال داس وغیرہ شعراء کا ذکر کیا جائے۔ اور ان سے اردو والوں کو روشناس کیا جائے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ اردو کے گمنام ہندو مصنفین کو سامنے لایا جائے۔ ان کی تصانیف سے فائدہ اٹھایا جائے۔ جہانتک ہوسکے ادب میں حجازی عنصر کم کیا جائے۔ ہندی پن سے اردو کا حسن بڑھتا ہے۔ ہندی والوں سے پیشتر ہی اردو شعراء کا کلام اور ان کی سوانح عمریاں نیز الف لیلیٰ۔ بوستان خیال طلسم ہوش ربا۔ چہار درویش وغیرہ چھپوا کر اپنے یہاں عام کر دیا ہے۔ اردو والوں کو چاہئے کہ پریم ساگر۔ نابھ جی کا بھگت مال۔ تلسی کرت رامائن وغیرہ چھپوا کر پڑھیں اور جدید ہندی یعنی کھڑی بولی کی بے شمار بانوں سے فائدہ اٹھائیں۔

اردو میں مجلسی رنگ ہے۔ اور ہندی میں سماجی رنگ۔ اردو زبان کو صاف اور شستہ بنا سکتی ہے۔ اور ہندی اسے عوام کے لائق۔ جو لوگ مشکل الفاظ جا اور بے جا استعمال ہی کو فضیلت کا لازمہ سمجھتے ہیں۔ وہ اردو ہندی دونوں کے دشمن ہیں۔[1] جتنے ہی بدیشی اور اَنمل الفاظ ہماری زبان سے خارج کئے جائیں گے اسی قدر اس میں ملکی اور مقامی رنگ آتا جائے گا۔ یہ مانا کہ بغیر فارسی ترکیبوں کے زبان میں چاشنی نہیں آتی۔ لیکن ان کا استعمال صرف اتنا ہی ہو چاہئے جس قدر آٹے میں نمک۔

ہندوستان کی خدمت کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اردو ہندی کا ایک دوسرے سے میل کرایا جائے۔ یہ میل فرقہ پروروں سے نہیں ہوگا۔ بلکہ کشادہ دلی اور روشن خیالی سے مسلمان مصنفین کا فرض ہے۔ کہ وہ سیاست، مذہب۔ اور فرقہ پروری سے زبان کو الگ رکھیں۔ ادب میں پاکستان یا مسلم لیگ کا تخیل مستحسن نہیں۔ جس روز اردو کے دامن سے۔ یہ دھبہ مٹ جائے گا۔ ہندی کے اخبارات اور رسالے بھی فرقہ وارانہ ذہنیت سے کام نہ لیں گے۔ پھر تو ہندوستان کی مکدر فضا میں کم از کم ادب ایک ایسی چیز ہوگا۔ جو تاریکی میں روشنی کا کام کر سکے گا۔

گوری سرن لال ایم اے گورکھپوری

---

[1] یہ جذبۂ عصبیت مسلمان کس طرح گوارا کریں گے۔ یہی تو منافرت اور مغایرت کا سبب ہے۔ (شہاب)

[2] آپ کا یہ کہنا کہ بدیشی انمل الفاظ ہماری زبان سے خارج کئے جائیں۔ انتہائی جانب داری ہے۔ آپ کو یہ کہنا چاہئے۔ کہ چھوٹے چھوٹے اور عام فہم لفظ ہوں، خوش آیند لفظ ہوں۔ خواہ کہیں کے ہوں۔ یہ ہے اردو کی تعریف۔ سودیشی اور بدیشی کہنے میں غیریت کی بو آتی ہے۔

کیفِ تغزّل

اثر — علامہ پنڈت برج موہن صاحب دتاتریہ کیفیؔ ۔ مدظلہٗ

وہ جلوہ، جلوہ ہے جبتک نہاں نقاب میں ہے
جو بے حجاب ہو تو پھر تو کس حساب میں ہے

صدا اک ایسی سنی دل سے زیر و بم بھولے
اب ایک تار ہی لرزاں مرے رباب میں ہے

تو رو برو ہے، جہاں سے جو موند لیں آنکھیں
حجاب یہ بھی، الٰہی، کوئی حجاب میں ہے

وہ دے پیالہ، کہ کونین سے ہوں مستغنی
یہ جام و بادہ بھی ساقی کسی حساب میں ہے

پڑی جدھر وہ نظر، عقل و ہوش رخصت تھے
جو آنکھ میں تری مستی ہے کب شراب میں ہے

ہے اضطراب و تحرّک، حیات کی تعریف
بتاؤں کیا تجھے راحت جو اضطراب میں ہے

ہے بند دیدۂ دل تو ہے خوابِ بیداری
تو جاگتا بھی اگر ہے تو صرف، خواب میں ہے

خدائی میں نہیں کوئی جو ہو بری اس سے
جو انقلاب نہیں ہے تو انقلاب میں ہے

وہ علم ہی کیا ہے نہ جس پر عمل ہو، اے عالم
لکھا ہوا تو سبھی کچھ تری کتاب میں ہے

جو زندہ دل ہیں ہمیشہ، جوان رہتے ہیں
بہارِ زیست یقیناً، اسی شباب میں ہے

تغیّرات نہ ہوں کیوں، غزل کے مضموں میں
زمانہ دیکھتے ہو، دورِ انقلاب میں ہے

یہ مے پرست جو سمجھا ہے، تو وہ مستِ الست
بہت مغالطہ کیفیؔ، تمہارے باب میں ہے

عاشقِ شاداں

صادق نے بڑے غور سے رکشا کی طرف دیکھا۔ آنکھیں جھکا کر اونچی کیں، دوبارہ دیکھا، رومال سے منہ پونچھا۔ سر کھجایا۔ پھر دیکھا، اس کو اپنی نگاہوں کا یقین نہ تھا۔ اس کے خیال میں اس قدر رنگینی کبھی نہیں پیدا ہوئی تھی۔

رکشا میں نقاشِ قدرت کا ایک مرقع۔ حسن کی ایک تصویر۔ جمال کا ایک پیکر بیٹھا ہوا تھا۔ کیسا پیکرِ جمال؟ جسکی ہر ادا بلا تھی، جس کا ہر انداز ایک آفت تھا۔ بڑی بڑی شوخ آنکھیں بھرا بھرا کتابی چہرہ۔ شاداب ستواں ناک چھوٹا سا حسین دہانہ مسکراہٹ سے لبریز۔

رکشا ۔۔۔ ڈاک خانہ کے سامنے سے گذر کر دکانوں کی طرف چلی صادق نے نگاہ کا بھی زاویہ بدلا۔ نگاہ کے ساتھ قدموں کو حرکت ہوئی۔ چڑھائی اور اُتار کے سنگم پر رکشا رکی صاحبِ رکشا کو اپنی قوتوں کا علم تھا۔ وہ صادق کی گھبراہٹ، اس کی بے اختیارانہ حرکات اس کے مضطر شوق کو تاڑ چکی تھی، اس نے اپنے جادو کے بل پر یہ سمجھ لیا تھا کہ صادق اس کا شکار ہو چکا ہے۔ وہ کچھ دیکھنے کے بہانے کھڑی ہوئی۔ مڑ کر پیچھے دیکھا اور ایک انداز کے ساتھ ہلکی سی انگڑائی لی۔ صادق کی رگ رگ میں ایک درد پیدا ہو گیا۔ سینکڑوں تیر سن سناتے ہوئے کلیجے کے پار نکل گئے۔

رکشا پھر چلی اور تھوڑی دور جا کر لیلا رام سندھی ریشمی کپڑے والے کی دوکان پر کھڑی ہو گئی۔ صادق گویا، وہیں تھا، اس نے حسینہ کی پوشاک پر نظر ڈالی۔ وہ سرخ رنگ کی ساڑھی میں ملبوس تھی۔ اس کا جمپر ایک عجیب دلکش قطع کا تھا۔ گردن کے نیچے کا مرمریں حصہ عریاں تھا۔ زیورات سے بے نیاز تھی۔ کانوں میں نیلم کے آویزے۔ اور ہاتھوں میں ایک ایک چوڑی کے سوا۔ اور کچھ نہ تھا۔

رکشا سے اترتے اترتے جان بوجھ کر، ہاں ہاں جان بوجھ کر رومال زمین پر گرا دیا۔ اور خود دکان کی طرف بڑھی۔ صادق نے رومال اٹھا لیا۔ اور اپنے سانسوں کی تیزی کو روکتا ہوا قریب پہنچا۔

صادق (خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر) "غالباً یہ رومال آپ کا ہے"؟ آواز ایسی گلوگیر تھی کہ گویا کوئی کنوئیں میں بول رہا ہے۔

عورت (صادق کی طرف متوجہ ہو کر) "جی ہاں۔ شکریہ" وہی کافر تبسم ہونٹوں پر تھا۔ "آپ نے بڑی زحمت فرمائی"۔ اور ایک دل کے جذبات ٹٹولنے والی نگاہ صادق کے سراپا پر ڈالی صادق نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے رومال پیش کیا۔ اور وہیں جم گیا۔

"کیا میں اپنے کرم فرما کا نام دریافت کر سکتی ہوں؟"

اس خلاف توقع سوال پر صادق کے تمام جسم میں ایک طوفانِ مسرت بپا ہو گیا۔ زبان لڑکھڑا گئی۔ ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ بمشکل اپنے جذبات پر قابو حاصل کرتے ہوئے۔ "شوق .... شوق سے ..... میرا نام ... مجھ کو صادق کہتے ہیں۔" ..

"دولت خانہ"؟

"کانپور"

"شغل"

"تجارت"

"تعلیم"

"بہت معمولی"

"شملہ تشریف آوری کا سبب؟ تفریح یا اور کوئی ... ...؟

"میرے والد ایک کامیاب تاجر ہیں۔ ایک دوکان یہاں
بھی ہے۔ اسی سلسلہ میں یہاں آیا ہوا ہوں۔"
اگر کوئی دوسرا ہوتا تو شاید اتنے سوالات کو اپنی ہتک
سمجھتا۔ لیکن صادق تعلیم یافتہ نہیں تھا۔ احساس کیوں کر ہوتا۔
اس نے اپنے ہوش درست کرتے ہوئے کہا۔
"کیا میں آپ کی نسبت کچھ پوچھ سکتا ہوں گستاخی تو
نہ ہوگی ...؟"
"اوہ یس، میرا نام گوہر ہے۔"
"سکونت"
"لکھنؤ۔ اور یہاں ۲۳ ایم بازار میں مقیم ہوں۔"
"آئندہ نیاز کی صورت؟"
وہ مسکرائی۔
"تشریف لائیے۔ میں خود مختار ہوں۔ غریب خانہ اغانہ
بے تکلف ہے۔ ہر وقت ملتی ہوں۔"

صادق نے دن کا باقی ماندہ حصہ اور رات مشکل سے
کاٹی۔ اس کو جسم کا ریشہ ریشہ تڑپتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ قلب میں
ایک ہیجان برپا تھا۔ دماغ میں ہزاروں چراغ جلتے اور بجھتے تھے۔ جو دوست
ملنے آیا۔ کہلوا دیا کہ موجود نہیں۔ نہ سینما گیا۔ نہ ریڈیو سنا نہ کسی
سے بات چیت کی۔ نہ پلنگ پر لیٹا۔ والدہ نے کھانا نہ کھانے کی وجہ
دریافت کی۔ والد نے اس پریشانی کا سبب پوچھا۔ کچھ نہ بتا سکا۔ اس
کی آنکھوں کے سامنے ایک سرخ پوش صبیح رنگ چہرہ تھا جس
کے برق وش دانتوں کی چمک ہر لحظہ محسوس کرتا تھا۔ ہزاروں
سریلے باجے اس کے کانوں میں بج رہے تھے۔ خدا خدا کرکے
رات ختم ہوئی۔ صبح ہی سے وہ مس گوہر کی ملاقات کی تیاری میں
مصروف ہو گیا۔ کبھی سوٹ پہنتا، ہیٹ لگاتا۔ کبھی شیروانی
چوڑی دار پاجامہ اور ترکی ٹوپی سے آراستہ ہو کر آئینہ میں
دیکھتا۔ لباسوں میں دیر تک رد و بدل ہوتی رہی۔ آخر پتلون
ترکش کوٹ اور ترکی ٹوپی کی ترتیب پسند آئی۔ بال بنائے
اور راستہ کے نشیب و فراز طے کرتا ہوا مس گوہر کے مکان
پر پہنچا۔ دربان کے ہاتھ کارڈ بھیجا۔
"ایم صادق"
ایک مختصر سے کمرے میں بٹھائے گئے۔ یہ موجودہ طرز کے
تمدن پر سجا ہوا تھا۔ انتظار کے لمحے گذارنے کٹھن ہوگئے۔ ہر سانس
ایک سال کے برابر تھا۔ کبھی کھڑا ہوتا کبھی بیٹھتا۔ یکایک ایک قرمزی
رنگ کے پردے کو جنبش ہوئی۔ اور پری مس گوہر خراماں خراماں
تشریف لائیں۔ پرستان کی پری اور مس گوہر میں کوئی فرق نہ تھا
ہر چیز جاذب نظر تھی۔ اعضا کے تناسب کے ساتھ لباس کی وضع
اور بالوں کا مشرقی انداز سے پشت پر بکھرا ہوا ہونا صادق ہی سمجھ
سکتا تھا کہ کیا تھا ؎

سوئے زلفش نظرے کردن و رویش دیدن
گاہ کافر شدن و گاہ مسلماں بودن

آتے ہی مصافحہ کیلئے ہاتھ بڑھایا۔
"آپ تشریف لائے بڑی مہربانی فرمائی۔"
ہاتھ کیا ملا۔ گویا بجلی کا تار چھو لیا۔ سارا بدن کانپنے لگا۔
خشک ہونٹوں کو زبان۔ برابر تری پہنچا کر جواب کیلئے تیار کر رہی تھی
مگر حسن کی گرمی پر کیا بس چلتا۔ آخر بدقت کہا۔
"مزاج عالی؟"
"خدا کا شکر ہے۔ اپنی کیفیت فرمائیے۔" اور مسکرا کر ایک
اور بجلی گرائی۔
"اچھا ہوں۔ صادق نے جواب دیا۔ اور تقریباً دس بار
فی سکنڈ کی رفتار سے آنکھیں بند کیں اور کھولیں۔
وہ صوفے پر بیٹھ گئی اور صادق کو بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا
صوفے پر بیٹھ کر صادق کے اضطراب میں کچھ کمی ہوئی۔ وہ نیچی نگاہ کئے
خاموش کسی خیال میں محو تھا۔ اور مس گوہر شوخی سے اس کو دیکھ
دیکھ کر مسکرا رہی تھی کہ یکایک صادق نے گردن اٹھا کر کہا۔
"کیا آپ شادی شدہ ہیں؟"
گوہر نے سر سے پاؤں تک صادق کو دیکھا۔ سر ہلا دیا

مسکرائی،

"آپ کا کیا خیال ہے"؟

"میں سمجھتا ہوں کہ آپ ابھی تک ناکتخدا ہیں۔"

"آپ کا خیال صحیح ہے۔"

"اللہ کا شکر ہے۔" چھت کی طرف منہ اٹھا کر صادق نے کچھ اس انداز سے کہا کہ مس گوہر کو بے تحاشا ہنسی آگئی لیکن اس نے ہنسی کو روک کر تیوری چڑھالی۔ اور صادق کو گھورتے ہوئے بولی۔

"کیوں! اس میں شکر کی کیا بات ہے۔"

"مس صاحبہ آپ کو نہیں معلوم کہ میرے دل میں آپ کے متعلق کیا خیالات ہیں۔ میں آپ کو اچھا ... بہت ہی اچھا سمجھتا ہوں۔ مجھ کو آپ سے اتنی محبت ہو گئی ہے کہ بیان نہیں کر سکتا۔ جی چاہتا ہے کہ میں آپ کی پوجا کیا کروں۔ اور اس لئے میں چاہتا ہوں کہ آپ ہمیشہ کے لئے میری ہو جائیں۔"

مس گوہر مسکرائی۔ بس سے پہلو بدلا۔

"آپ مجھ سے جواب کے طالب ہیں"

"قدرتاً" ... وہ دوبارہ مسکرائی۔

"تو گویا آپ بھی انسان نما حیوان ہیں۔"

"کیوں؟"

"بندہ نواز کے آدمی کے پیر شدی۔ ابھی کچھ دن دنیا کی ہوا کھائیے۔ زندگی کی خیر منائیے۔ پھر موت کو طلب کیجئے گا۔"

"میں نہیں سمجھا"

"یہ نا سمجھی۔ اور موت کو دعوت" وہ پھر مسکرائی۔

"میں عرض کرتا ہوں کہ مجھکو آپ سے محبت ہو گئی ہے۔"

"جی ہاں۔ میں ممنون ہوں کہ جناب۔ مجھ سے محبت فرماتے ہیں۔ میں آپ کی چاہت کو نہیں روکتی۔ چاہیئے۔ شوق سے چاہیئے۔ جس طرح اور جب جی چاہے چاہیئے۔ لیکن یہ کیا ضرور ہے کہ جناب چونکہ جناب میری ذات سے اتفاقیہ محبت فرماتے ہیں اس لئے میں بھی ہمیشہ کے لئے جناب کی لونڈی ہو جاؤں۔"

"آہ! گوہر تم محبت جیسے پاک جذبہ کی اہانت کر رہی ہو۔"

غصہ سے سرخ ہو کر وہ کھڑی ہو گئی۔

"محبت ... محبت ... محبت کسی سے سنکر ایک لفظ سیکھ لیا ہے۔ تم کیا جانو کہ اس کے کیا معنی ہیں۔ محبت تمہارے خیال میں صرف یہ ہے کہ ایک حسین عورت کی رعنائیاں لوٹو۔ اس کی معصوم رعنائیوں پر ڈاکہ ڈالو۔ اور اس کو اپنی ہوس رانیوں کا شکار بناؤ۔ سبحان اللہ۔ کیا مطمح نظر ہے۔"

صادق اس طرز گفتگو سے گھبرا سا گیا۔

"مگر میری محبت بناوٹی نہیں ہے۔ خدا کے لئے آپ میری چاہت کو بازاری چاہت نہ سمجھیں۔"

"دنیا کا ہر ایک مرد اسی ٹٹی کی آڑ میں شکار کھیلتا ہے۔ اس کی یہی کوشش ہوتی ہے۔ کہ وہ اپنی محبت کو پاک اور اپنے جذبات کو سچا ثابت کرے۔ ذرا سوچو تو اگر میرے گورے گورے جسم کی بجائے ایک سیاہ چیچک سے داغی جسم ہو۔ میری حسین آنکھوں کی جگہ چھوٹی چھوٹی بدنما چندی آنکھیں ہوں۔ اس سڈول بدن۔ ان خوبصورت دست و پا کے بدلے کونڈا سا پیٹ لولے لنگڑے ہاتھ پاؤں ہوں تو کیا جناب اسی طرح محبت جاری رکھیں گے اور اس پری کے عوض اس دیوانی کی یونہی پوجا کریں گے ...؟"

صادق اس تصویر پر کانپ گیا۔ وہ خوف زدہ سا ہو کر مس گوہر کی شکل دیکھنے لگا۔ گوہر نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"بس! عاشقی ختم۔ محبت کا جوش تمام۔ آپ محض ایک خیالی تصویر پر کانپ اٹھے۔ کیا عاشق کے لئے کامیابی ضروری ہے کیا عاشقی بغیر وصل نہیں ہو سکتی؟ بندہ نواز آپ نے بیکار اپنا قیمتی وقت خراب کیا۔ آپ محبت کا دعوی کرنے کے بجائے یہ فرما سکتے تھے کہ میں وصل چاہتا ہوں۔ آپ کا مطلب صاف ہو جاتا۔ اور مجھ کو بھی جواب میں اس قدر کاوش نہ کرنی پڑتی۔"

صادق کھسیانا سا ہو کر چار و ناچار کھڑا ہو گیا۔ اور رقت آمیز لہجہ میں بولا۔

"تو کیا میرے لیے کوئی امید نہیں؟"

"امید کس بات کی؟ میرے وصل کی! میں ایک آسان تدبیر بتاتی ہوں۔ آپ بازار تشریف لے جائیں عصمت باختہ حسن فروشوں کی دکانوں پر چند سکوں میں آپ کو ایک عورت کی رعنائیاں ملجائیں گی۔"

"خدا حافظ!" صادق نے بے بسی اور غصہ کی حالت میں کہا۔

"خدا حافظ و ناصر میرے عاشق ناشاد۔" مس گوہر نے جواب دیا۔ سڑک تک صادق کو مس گوہر کے طنزیہ قہقہے کی آواز سنائی دی۔

صادق غم اور غصہ میں بھرا ہوا گھر آیا۔ پہلے سے زیادہ مضطرب، پریشان حال، بے چین۔ دن بھر منتشر حواس رہا۔ نہ کسی سے بولا۔ نہ کسی کو بات کرنے کا موقع دیا۔ آہ و زاری میں رات گذاری۔ دو چار روز میں جب ذرا سکون ہوا۔ طبیعت ٹھیری تو [illegible] بے غیرتی غالب آئی۔ والدین کے انتشار اور ملامت کا اثر ہوا۔ تو مس گوہر کے متعلق معلومات حاصل کرنا شروع کیں۔ شملے کے احباب اور لکھنؤ کے لوگوں سے دریافت کرنے پر راز یہ کھلا کہ مس گوہر صاحبہ مغربی و مشرقی حسن کی [illegible] داستان ہیں۔ باپ سے دولت اور ماں سے [illegible] ورثہ میں ملی ہے۔ تعلیم یافتہ ہیں۔ پردے میں سمائی نہ ہو سکی۔ قید پسند نہیں۔ آزادی کی ہوا میں مست ہیں، تاہم دامن پاک ہے۔ ماں باپ دونوں مر چکے ہیں لیکن شرافت و خودداری زندہ ہے۔ جائداد کافی ہے۔ عشاق بھی بکثرت ہیں۔ مگر شادی نہیں کی۔ تلاش ہے کہ کوئی ہم رنگ جوڑا ملجائے۔

ایک روز صادق اپنے احباب کے ساتھ ہوا خوری کر رہا تھا۔ کہ دور سے مس گوہر رکشا پر سوار گذرتی دکھائی دی۔ دبی ہوئی آگ بھڑک اٹھی جوں توں کر کے احباب سے رخصت ہو کر گھر پہنچا حیران تھا کہ کس طرح اس آہوئے وحشی کو رام کرے۔ کیا کیا جائے کہ یہ میری محبت سے متاثر ہو۔ دل دکھانے کی چیز نہیں، کہ سینہ چیر کر دکھایا جائے۔ دیر تک عقل اور عشق میں کشاکش رہی بہت جبر کیا۔ آخر پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا۔ ادھر والدہ نے کھانا کھانے کا تقاضہ کیا۔ ادھر یہ اپنی دھن میں گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ اور سیدھا مس گوہر کے مکان پر پہنچا۔ کارڈ دیتے ہی طلبی ہوئی وہی کمرہ وہی صوفہ۔ اور وہی مست ناز۔

"آیئے آیئے! عاشق نامراد تشریف لائیے۔ خوش آمدید" اور وہی قیامت خیز تبسم۔

صادق نے اس طعنہ کا کوئی جواب نہیں دیا۔ جواب ہی کیا تھا جو دیا جاتا۔ وہ تو سہم رہا تھا۔ کہ دیکھیے اب اور کن الفاظ سے میرا خیر مقدم کیا جاتا ہے۔

"کیوں جناب کیا عاشق آٹھ آٹھ دن بغیر محبوب کے دیدار زندہ رہ سکتے ہیں؟"

صادق جھنجھلا گیا۔ اس کے تن بدن میں شعلے بھڑک اٹھے "آخر تم چاہتی کیا ہو؟ جذبۂ محبت [illegible] تمہارا کیا مطلب ہے؟ میں مرا جاتا ہوں۔ میرے دم پر بنی ہوئی ہے۔ اور تم [illegible] سمجھتی ہو۔ میں نہیں سمجھتا کہ تم کو اپنی حالت کا کیونکر یقین دلاؤں۔ تمہارے ساتھ کیا کیا جائے؟" وہ قہقہہ مار کر ہنس دی۔

"آپ کو میرے خیال [illegible] آپ نے مجھ سے پوچھ کر محبت کی تھی؟ آپ اپنی مرضی سے عاشق ہوئے ہیں۔ اسلئے آپ کا جو دل چاہے کیجیے۔"

صادق بے ساختہ اس کے قدموں پر گر پڑا۔ اور گلوگیر آواز میں التجا کی۔

"گوہر خدا کے لئے رحم کرو۔"

"رحم!" وہ مسکرائی۔ "رحم! تم مرد ہو کر جن کو اللہ نے حکومت کے لئے پیدا کیا ہے۔ اور وہ عورتوں پر حکومت کرنا اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں۔ ایک کمزور عورت کے سامنے ناک رگڑ رہے ہو۔ اس مسکینی کا مقصد یہی ہے نا۔ کہ [illegible] خوبصورت، رنگ برنگی [illegible]

بولنے والی چڑیا آ۔ اور جال میں پھنس جا۔ اے قفس پرست چڑیا رو! چاپلوسی کا دانہ ڈال کر دھوکا نہ دو۔ ایک نازک ریشم جیسے پروں والی چڑیا کو آزاد فضا میں رہنے دو۔ قفس کی ہوا اس کو راس نہیں.......

تمہارے پھندوں کی دل آویزیاں، تمہاری گرویدگیاں۔ اس وقت تک ہیں کہ تمہارے جذبات تشنہ ہیں۔ تم اور تمہارا شوق تازہ ہے تمہارے ارمان پورے نہیں ہوئے۔ کل جب تمہاری سیری اور جوانی کی خواہشات پوری ہو جائیں گی۔ تو پھر اسی غلامی کا سوال۔ اسی بیزاری کا جذبہ پیدا ہو جائے گا۔ جو مردوں کا عام خاصہ ہے۔"

"خدا ایسی باتیں نہ کرو۔"

"باتیں نہ کرو! یہ واقعات ہیں۔"

"کیا دنیا میں اس کے خلاف کوئی واقعہ نہیں ہوا۔ قیس نے لیلیٰ کے ساتھ کونسی بے وفائی کی۔ فرہاد نے شیریں پر جان دینے میں کیا فریب کیا۔"

"آخاہ" اس نے ایک قہقہہ لگایا۔ "یہ مجھے معلوم ہی نہ تھا۔ کہ آپ میں مجنوں کی روح حلول ہے۔ مسٹر صادق کے چولہ میں میاں فرہاد ہیں۔"

صادق حیران تھا۔ اس سے کوئی جواب بن نہیں پڑا آخر اس نے کہا۔

"تو کیا میں جاؤں؟"

وہ مسکرائی، یہ ہرا تہ پر مسکرانا صادق کے لئے قیامت تھا۔

"کیوں؟ کیا محبوب ہے ۔ دل بھر آیا۔ صحرا نوردی ہو چکی جو ہے شیر سے آئے؟

اللہ رے دعوئے محبت۔ اسی جلد طبیعت سیر ہو گئی تم تو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مجھ کو اپنا بنانا چاہتے تھے۔ مرحبا بیسویں صدی کے فرہاد و قیس مرحبا!"

"مگر تم میری ہنسی کیوں اڑاتی ہو۔ مجھ پر پھبتیاں کیوں کسی جا رہی ہیں۔"

"صادق صاحب بہتر ہے کہ یہ خیال دل سے نکال دیں چڑیا آپ کے جال میں پھنسنے سے انکار کرتی ہے۔"

صادق نے جیب سے رومال نکالا۔ آنسو پونچھے۔ کھڑا ہوا۔ مس گوہر کی طرف دیکھا۔ ایک ٹھنڈا سانس بھرا۔ اور بغیر کچھ کہے خاموش کمرے سے باہر نکل آیا۔

شملہ کے ان واقعات کو چھ سال کا عرصہ گذر گیا...

صادق کے والد کا انتقال ہو چکا ہے اور اب وہ اپنے والد کی تجارت اور امارت کا تنہا مالک ہے۔

والدہ کی خواہش اور اپنی ضرورت کے باوجود شادی نہیں کی۔ مس گوہر کی محبت اگرچہ اب بھی اسی طرح دل پر قبضہ کئے ہوئے ہے۔ لیکن یہ معلوم کرنے کبھی کوشش نہیں کی کہ وہ کہاں ہے اور کس رنگ میں ہے۔

اسی اثنا میں کاروباری سلسلہ میں اسے کلکتہ جانے کا اتفاق ہوا۔ ایک روز شام کو موٹر میں چڑیا خانہ والی سڑک پر جا رہا تھا۔ کہ یکایک موٹر کو ایک حادثہ پیش آیا۔ حادثہ سخت تھا۔ صادق چوٹ سے تو محفوظ رہا۔ مگر بے ہوش ہو گیا۔

خدا معلوم کتنی دیر تک بے ہوش رہنے کے بعد صادق نے آنکھ کھولی تو بجائے موٹر کے اپنے آپ کو ایک خوبصورت مسہری پر اور سامنے مس گوہر کو مسکراتے دیکھا۔ "شاید خواب دیکھ رہا ہوں" ٹھنڈا سانس بھرا۔ اور آنکھیں بند کر لیں۔

"جناب فرہاد! مسہری سے اٹھیئے۔ اور تیشہ سے سر پھوڑیئے"

اس آواز نے صادق کو چونکا دیا۔ اس نے پھر آنکھ کھولی اور پہلے سے زیادہ قریب مس گوہر کو ہنستے ہوئے دیکھا پھر آنکھیں بند کر لیں۔

"بیسویں صدی کے مجنوں آنکھیں کھولئے لیلیٰ ناقہ سے اتر آئی ہے۔"

صادق کسمسایا، آنکھیں کھولیں اور مسہری پر اٹھ کر بیٹھ گیا اپنے حافظہ پر زور دیا۔ بغور مس گوہر کو دیکھا۔ آنکھیں ملیں حیران

تھا کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ شام کو موٹر میں تھا۔ اور اب ایک نئے مکان میں مسہری پر ہوں اور مس گوہر سامنے۔

"کہیئے کیا حال ہے۔ کس سوچ میں ہو۔ بیوی بچوں کا خیال ہوگا؟"

یکفت مس گوہر نے کسی قدر متانت سے کہا۔ اس کا چہرہ متین تھا۔

"آہ! گوہر! بدنصیب کو بیوی اور اس کی محبت کہاں نصیب؟"

"کیا ابھی تک کنوارے ہو۔ شادی نہیں کی؟"

"شادی! آہ! شادی۔ میری شادی تو اب موت کے ساتھ ہوگی۔ جب تم نے مجھے پسند نہیں کیا۔ اور کون پسند کر سکتا"

"پھر کیا ارادہ ہے۔"

"جو پہلے تھا۔ مگر تم کو اس قسم کے سوال سے کیا واسطہ"

"صادق صاحب! میں اپنی رائے بدل چکی ہوں۔ تمہارے استقلال نے میرے خیال کو بدل دیا ہے۔ میں تم سے غافل نہیں رہی۔ شملہ سے واپس آکر میں نے تمہارے حالات کی جستجو کی۔ اور تم سے ملنا چاہا مگر واقعات نے مجھے لکھنؤ چھوڑنے پر مجبور کر دیا یہاں پہنچ کر میں نے کوشش کی کہ تم کو اطلاع دوں۔ لیکن ناکام رہی۔ آخر مایوس ہوکر امداد غیبی کی منتظر تھی کہ شام کو تم موٹر میں ہوا کھاتے نظر آئے۔ تمہاری موٹر یکایک ایک لاری سے ٹکرائی تم گر پڑے میری موٹر سامنے سے آرہی تھی۔ یہ منظر میری آنکھوں نے دیکھا۔ موٹر سے اتر کر دوڑی۔ تم بے ہوش تھے۔ قریب ہی میرا مکان تھا۔ تمہیں لائی۔ ڈاکٹر کو بلوایا۔ شکر ہے کہ کہیں چوٹ نہیں آئی تھی۔ ڈاکٹر نے اطمینان دلایا۔ اور آرام کرنے کی ہدایت کی۔۔۔۔"

"الحمد للہ کہ تم نے مجھے ثابت قدم پایا۔"

"اب میں ہمیشہ کے لئے تمہاری ہوں۔"

دوسرے روز محفل عقد تھی۔ صادق دولہا۔ اور مس گوہر دلہن۔ محبت کا پھل جو پہلے ترش نظر آرہا تھا۔ میٹھا نکلا۔

بچھڑے ہوئے مل گئے۔ اور عشق نے مدتوں کے بعد ارمانوں کا سہرا باندھا۔

(اشرف صبوحی دہلوی)

لمعات

وابستہ کر دیا ستمِ ناروا کے ساتھ
یہ کیا کیا سلوک دلِ مبتلا کے ساتھ

کمبخت دل بھی سرد ہے آہِ رسا کے ساتھ
اک شمع تھی کہ بجھ گئی ٹھنڈی ہوا کے ساتھ

ہونٹوں پہ جان آنے لگی ہر ادا کے ساتھ
لائے ہیں میرے پاس اجل کو لگا کے ساتھ

ہم کو تو چشمِ مست کی گردش سے کام ہے
صبح و مسا کا دور ہے صبح و مسا کے ساتھ

ہر روز امیدیں دل کی مرے ہو رہی ہیں پست
اُس بیوفا کے حسن کی نشو و نما کے ساتھ

آئی ہے جب سے موج نسیمِ بہار کی
جوشِ جنوں میں دوڑ رہا ہوں ہوا کے ساتھ

نیچی نظر سے دیکھ رہے ہیں وہ آئینہ
اب شوخیوں کی خوب چلے گی حیا کے ساتھ

تم جب سے ہو نگاہ میں، کوئی نہیں رفیق
دنیا کا رخ بدل دیا تم نے فضا کے ساتھ

نام و نمودِ عشق مٹانے سے، فائدہ؟
کب سے ہے دشمنی تمہیں اہلِ وفا کے ساتھ

کمبخت موت آئی، نہ آیا جواب خط،
پیغامبر بھی کھیت رہا کیا، قضا کے ساتھ

دل نے یہاں بھی حشر بپا عمر بھر کیا،
یہ حشر میں بھی فتنہ اٹھائیگا جلا کے ساتھ

دل سے نکل رہی ہیں دعائیں تو موت کی
دم بھی نکل نہ جائے کسی دن دعا کے ساتھ

وارفتہ اِن بتوں پہ ہے انورؔ فریفتہ
اِس بندۂ خدا کو بھی ضد ہے خدا کے ساتھ

از انور جمیل صاحب دہلوی

مُصلحینِ ادب کے فرائض

اردو شاعری نے ابتدا سے اب تک مضمون، زبان اور بیان کے اعتبار سے جتنے قالب بدلے سب اردو ادب کی ترقی اور زیادہ سے زیادہ دلآویزی کا باعث رہے۔ گذشتہ کی طرح آج کل بھی کئی طرح کی شاعری مروج ہے۔ قدیم شاعری کے پیرو اس وقت بھی بے حد و پایاں ہیں۔ حالانکہ جدید رنگِ شاعری بے انتہا مقبول ہے۔ اور اس نے اردو ادب کو ادبِ عالیہ کے صحیح مقام پر پہنچا دیا ہے۔

سرزمینِ عرب باعتبار شاعری دنیا میں خصوصیت کا درجہ رکھتی ہے۔ ایک زمانہ ایسا تھا کہ تمام دنیا کے مختلف الالسان جمع کرنے کے بعد بھی شعرائے عرب کی کثیر تعداد کو نہیں پہنچتے تھے۔ مگر یہ اردو شاعری کا زمانہ اس زمانے پر گوئے سبقت لے گیا ہے۔ عرب کی کثرتِ شعراء کے متعلق تو یہ کہہ سکتے ہیں، کہ سلاطین و امراء کی طرف سے مدح و ستائش کے صلے میں خلعت و انعام۔ جاگیر و مناصب کا عام رواج تھا یہی وجہ تھی کہ ہر موزوں طبع کو عام اس سے کہ شعریت طبع میں ہو یا نہ ہو۔ شاعرانہ صلاحیت رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو۔ مگر شاعری کے خبط میں مبتلا تھا۔ دوسری طرف ہم قوم سامعین بھی اچھے برے شعر پر داد و ستائش بے دریغ روا رکھتے تھے۔

دنیا کا ہر ملک ہمیشہ اپنے شعراء کی قدر کرتا رہا ہے۔ لیکن عرب جیسی خصوصیت کہیں شاذ و نادر بھی نظر نہیں آتی۔ عرب والے شاعر کو اپنی آبرو اور اپنے قبائل کے ناموس کا محافظ سمجھتے تھے۔ جب کسی قبیلے میں کوئی شخص شاعری میں ممتاز ہوتا۔ تو دوسرے قبیلے والے بڑے فخر کے ساتھ اپنی لڑکیاں پیش کرتے۔ اور مبارک باد دینے آتے تھے۔ اس موقعے پر آپس میں مل کر ایسے خوش ہوتے اور خوشیاں مناتے تھے کہ سلاطین کی شادیوں میں بھی وہ شادیانے اور جوشِ مسرت خواب تھا۔

اہلِ عرب کا یہ نظریہ رہا ہے کہ شاعر اپنے قبیلے کی ناک، اور انتقام گیر ہاتھ ہوتا ہے۔ یعنی صدیوں کے دوسرے دشمن قبائل کو اپنے زورِ شاعری سے ہیچ و پوچ قرار دیکر اپنے قبیلے کے اعزاز و تشخص کو نمایاں کرتا ہے۔ اسی طرح ہمارے حسب و نسب اور زبان کی حفاظت کرتا ہے۔ ان مذکورہ اسباب کی موجودگی میں شاعری ضروری اور شاعر کا وجود لازمی تھا۔ مگر ہندوستان کو بالخصوص اس زمانے میں کثرتِ شعر سے کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے اور شاعر کس قدر و منزلت اور صلے کی امید میں کی جا سکتی ہے۔ یہہ کچھ جاننے کے بعد بھی ہندوستان کے شہر تو شہر کوئی قریہ اور گاؤں ایسا نہیں جہاں شاعروں کی کثرت نہ ہو۔ اس کثرت کا سبب بڑی تاویلوں کے ساتھ یہی ہو سکتا ہے۔ کہ یہ زمانہ ہماری اردو شاعری کی ترویج و ترقی کا ہے۔ جدھر دیکھئے شعر و شاعری کا چرچا۔ ہر شخص شعر فہمی و شعر گوئی کا دلدادہ۔ جس وقت ان دونوں گروہ کی فوجِ ظفر موج کا خیال آتا ہے تو دم گھٹنے لگتا ہے۔ کیونکہ ان میں سے معدودے چند ایسے شاعر ہیں جن کی شاعری کے خدوخال اور نقش و نگار انسانی جذبات و خیالات کا دل آویز مرقع ہیں۔ باقی شعراء کی گل افشانیاں اردو ادب کے دامن پر کریہہ اور بھیانک دھبے ہیں کہ ان کے دیکھنے سے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔

یہ کلیہ مسلّم ہے کہ ہر زبان شاعری کے ہی آغوش میں پرورش پاکر پروان چڑھتی ہے۔ اردو کے وہ معدودے غیر معمولی شاعر جن کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے۔ اردو شاعری کو اس منتہائے عروج اور انتہائے ترقی پر لے گئے ہیں کہ دنیا کی بڑی سے بڑی ترقی یافتہ

زبان کی شاعری بھی اس وقت فرش پا انداز ہے۔

یہ انہی قدسی نفوس شعراء کی معجز بیانی کا صدقہ ہے کہ آج اردو زبان متفقہ طور پر ہندوستان کی مشترکہ اور قومی زبان مانی جاتی ہے۔

اس زبان میں ہندوستان کی تمام مردہ اور نیم مردہ زبانوں کے برخلاف وہ وہ محاسن اور جاذبیتیں ہیں کہ اگر مستقبل قریب میں نہیں تو بعید میں۔ میں وثوق کہہ سکتا ہوں کہ زبانِ اردو تمام دنیا کے ممالک کی زبان ہوگی یہ فخر تو اب بھی اردو زبان کو حاصل ہے۔ کہ دنیا کے مہذب اور ترقی یافتہ ملکوں میں سمجھی ہی نہیں جاتی بلکہ عام رجحانات کو دیکھتے ہوئے اس زبان کی تعلیم وتدریس بڑی سرعت کے ساتھ جاری ہے۔

اتنی ترقی اور ترویج کے بعد بھی ہم پر کچھ فرائض عائد آتے ہیں۔ وہ یہ کہ ہم ہندوستان میں دلی اور لکھنؤ کی زبان مستند سمجھتے ہیں۔ دلی کی زبان بدیں وجہ کہ یہ دلی میں بڑھی۔ پلی پرورش پائی۔ اور پروان چڑھی۔ لکھنؤ کی زبان اس لئے معتبر ہے کہ سلطنت مغلیہ کو زوال ہوا۔ تو تمام باکمال شعراء اور شریف گھرانے ادھر منتقل ہو گئے۔ حتیٰ کہ وہیں مرے کھپے۔

اب ہمیں چاہیئے کہ اپنی سعی بلیغ اور محنتِ شاقہ سے ہندوستان کے گوشے گوشے کو دہلی اور لکھنؤ بنادیں۔ تاکہ دو مرکزی خصوصیات ملکی اور مساوی نظر آئیں۔ وہ اسی طرح ہو سکتا ہے۔ کہ شاعری کے مقررہ ضوابط۔ مجوزہ اصول اور عروض وبحور کا لحاظ روزمرہ اور محاورات زبان کی قید کے ہم پابند رہیں۔

بعض مغرب پرست نوجوان اس کوشش میں رہتے ہیں کہ شاعری کو عروض وقوافی کی قیود سے آزاد کردیا جائے۔ اس آزادی سے ان کا مقصد یہ ہے کہ اظہارِ خیال میں زیادہ سہولت ہوگی۔ اگر یہ نظریہ قائم کرنے سے پہلے ہمارے مغرب زدہ نوجوان مشرق کے علمائے شعروادب سے مشورہ کر لیتے تو اس بدحواسی کیساتھ اپنے نظریئے کی اشاعت نہ کرتے۔ بفرضِ محال ردیف وقوافی کی قید مروجہ اصول ومسلمہ عروض سے روگردانی کے بعد شعر کہا جائے تو یہ یقینی امر ہے کہ شعر من حیثیت الشعر نہیں ہوگا۔ بلکہ نثر کے بے ربط چند ٹکڑے۔ یا نثر کی ایک سطر سے زیادہ اہمیت نہیں دیجا سکے گی۔ ہمارے خیال سے یہ کہنا کہ شاعری عروض واصول سے آزاد کردیجائے ٹھیک نہیں۔ ۔ ۔ بلکہ سیدھے لفظوں میں مافی الضمیر کا اظہار یوں کیوں نہیں کرتے کہ شاعری اپنے قواعد وضوابط کے اعتبار سے مشکل ترین چیز ہے۔ اس کو ترک کرکے صرف نثر کو رواج دیا جائے۔ اب یہ فیصلہ شاعری کی صورت مسخ کرنے سے بہتر ہے۔

میں یہ بھی عرض کردوں کہ یہ وہ مغرب زدہ نوجوان شاعری کی صورت مسخ کر رہے ہیں۔ جو ان کی کاہل وجود۔ محنت کے چور۔ اور کالجوں کی آغوش میں پرورش پائے ہوئے ہیں جنہیں بغیر کسی محنت کے کالجوں کے مصارف رکوٹ، بوٹ اور سیر وتفریح کے اخراجات حاصل ہوتے رہتے ہیں۔ یہ ہرگز نہیں چاہتے کہ مشرقی علمائے ادب کے سامنے زانوئے تلمذ طے کریں اور ان کے ادب وآداب سے اپنے نفسِ امارہ کو زیر ہونے دیں۔ اسکول کے ماسٹروں اور کالج کے پرفیسروں نے ان کی اس قدر رعایت، اور ناز برداریاں کی ہیں۔ یہ اپنا پتہ مار کر نکات ادب اور رموز شاعری نہ سیکھ سکیں۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ جب محنت نہیں ہو سکتی تو کیوں شاعری کا شوق چراتا ہے۔ تمام باکمال شعراء کے حالات شاہد ہیں۔ کہ شاعری محنت شاقہ اور عرق ریزی چاہتی ہے۔ یہ فن نازپروردہ جواں سال کالج کے صاحبزادوں کے بس کا نہیں۔

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا اصل مقصد میرا یہی ہے۔ کہ صحیح راہ سے بھٹکے ہوئے نوجوانوں کو ہم اپنے عمل اور کردار سے رو راست پر لائیں۔ اس کا آسان طریقہ یہ ہو سکتا ہے۔ کہ ہم اپنے ادبی کارنامے مجالس اور صفحات پر لانے سے پہلے علمائے ادب اور اقلیم

فن کو ایک نظر دکھائیں جو غلطیاں اور کمزوریاں ہم سے سرزد ہو گئی ہوں وہ دور ہو جائیں۔ ہم جب ایسا کریں گے۔ تو یہ امر ضروری ہے کہ مبتدی اور بہکے ہوئے لوگوں میں غلطیاں تمدیج پائیں گی نہ استقام کی گنجائش رہے گی۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص آج کوئی غلطی کرتا ہے اور اس پر اعتراض کیا جاتا ہے تو غلطی کرنے والا معترض کو ہماری کل کی غلطیاں ثبوت میں سند دیتا ہے۔ اب خواہ مخواہ ہماری ندامی غفلت میں غلطی کا جواز مبتدی کے ہاتھ آگیا۔ دوسرا نقصان ادب کو یہ پہنچتا ہے کہ ترقی کی راہیں مسدود ہو جاتی اور باکمال شخصیتیں صدیوں تک میسر نہیں آتیں۔ ایک نوجوانانہ فروگذاشت ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔ وہاں تو غضب یہ دس اشعار ہیں فنی نقطۂ نگاہ سے وہ شعر ہی شعر کہلانے کے مستحق نہیں ہوتے۔

گذشتہ ماہ کے اوائل میں ایک "نوجوان" مشاعرے میں تشریف رکھتے تھے۔ ان کی نشست اور حرکات و سکنات سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ ایک خوش فکر اور ہونہار شاعر ہوں گے۔ وجہ یہ کہ ان کو آداب مجلس کی پروا تھی نہ اساتذہ کے حفظ مراتب کا لحاظ۔ اپنی بے بضاعتی علم او مشرقی آداب مجلس کا کوٹ، بوٹ، سوٹ اور ہیٹ کے استعمال سے پتہ نہیں ہونے دے رہے تھے۔ میر مجلس بھی اس قسم کے مغرب زدہ صاحبزادوں کی ذہنیتوں سے بہرہ مند تھے۔ بحیثیت شاعر ان کو بہتر ہی جگہ دی اور اچھے موقع پر پڑھنے کو بلایا۔ یہ مسند پر تشریف لائے۔ پہلے ہاتھ سے ٹائی کا لر درست کیا۔ اور کھنکار سے گلا صاف کیا۔ اس کے بعد نہایت خوش الحانی سے یہ مطلع پڑھا

تمہارے دم سے ہے یاں تک عروج زندگی، اپنی
کہ تیری دیکھ لی شکل، ہو گئی بس، بندگی، اپنی

سامعین بھی عموماً ان ہی کی طرح فن سے بے بہرہ ہوتے ہیں، چنانچہ شاعر صاحب کی سپید پوشی اور بے تکلفانہ شعر خوانی ہی کچھ کم نہ تھی اس پر خوش گلوئی مستزاد۔ اب کیا تھا ایک شور برپا ہو گیا۔ اور تعریف و توصیف کے پل بندھ گئے۔ مکرر اور سہ کرر شعر پڑھا گیا۔ اب بے چارے اہل فن اور سخن فہم شعر کی ساخت، اور شاعر کی ڈھٹائی پر نیچی نظر کئے ہوئے دم بخود بیٹھے ہیں۔ اگر شاعر کو عیوب شعر سے مطلع کرتے ہیں تو سامعین اور شاعر دونوں سے لڑائی مول لیتے ہیں۔ اگر خاموش رہتے ہیں تو مذاق سلیم کا خون ہوتا ہے۔ اور ناقابل تلافی غلطیاں رواج پاتی ہیں۔ غرض اسی قبیل کے آٹھ، سات شعر، شاعر صاحب بے دقتی جیروں میں الاپ گئے۔ اور سامعین اس قدر محظوظ و مسحور ہوئے کہ آخر وقت تک تعریف میں رطب اللسان رہے۔

اگر ان شاعر صاحب کو علاوہ دوسرے شعروں کے اس مذکورہ شعر ہی کے معائب کوئی سمجھائے تو کس دل سے کیونکہ ایسے جنٹلمین شاعروں کی بری بھی بات سمجھانے اور بتانے میں انسلٹ ہو جاتی ہے۔ ادھر سامعین جو مشاعرے کو سینما اور تھیٹر سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ صرف تفریح طبع اور ہنسنے ہنسانے میں اپنا تھوڑا وقت صرف کرنے آتے ہیں۔ ان کا مقصد ہرگز کسب فن اور تحصیل علم نہیں ہوتا۔ جہاں مشاعرے جیسی بزم ادب میں یہ نظریہ لئے ہوئے لوگ بیٹھے ہوں وہ کس طرح گوارا کریں گے کہ جس شعر کی ہم داد دیں اس پر کوئی شخص اعتراضوں کی بھرمار کرے اور ہم خاموشی سے نااہل قرار پائیں۔ نتیجہ عموماً یہی ہوتا ہے۔ کہ غلط گو شاعر پر اعتراض ہوا اور سامعین جامے سے باہر۔ غلط گو شاعر کی شہرت کا ذریعہ نافہم سامعین کے شور و غوغہ کو ہونا ہی چاہئے۔ آخر یہی غلط گو شاعر بازاری سامعین اور ناسمجھ لوگوں میں بڑے پائے کا شاعر مانا اور جانا جاتا ہے۔

اب میں مندرجۂ بالا مطلع کا شرح و بسط کے ساتھ تجزیہ پیش کرتا ہوں یہ مطلع فنی اعتبار سے صرف آٹھ غلطیوں کا حامل ہے

پہلا مصرع۔ تمہارے دم سے ہے یاں تک عروج زندگی اپنی

اس میں اولؔ غلطی تعقید ہے۔ یعنی "تمہارے دم سے ہے یاں تک" کی جگہ "تمہارے دم سے یاں تک ہے" ہونا چاہئے تھا۔ یہی روزمرہ ہے

دوسری غلطی "بیاں" کی جگہ "یاں" نظم کیا ہے۔ یہ لفظ متروک ہے۔

تیسری غلطی "عروجِ زندگی اپنی" کی جگہ "اپنا" ہونا چاہئے۔ کیونکہ عروج مذکر ہے۔ مؤنث نہیں۔

دوسرا مصرع ہے۔ کہ تیری دیکھ لی شکل ہوگئی بس زندگی اپنی

اس میں پانچ غلطیاں ہیں۔ کیونکہ پہلے مصرع میں۔ محبوب کو تمہارے کہا ہے۔ مگر دوسرے مصرع میں تیری کہہ کر شتر گربگی پیدا کر دی۔ اسی طرح۔ دوسری غلطی یہ کہ "تری دیکھ لی" کھلا ہوا ذم ہے۔

تیسری غلطی یہ کہ شکل کے مابعد ہاوزن سے خارج ہے۔ جس سے مصرعہ ناموزوں ہوگیا۔

چوتھی غلطی یہ کہ قافیہ سے قبل لفظِ بس کوئی معنی نہیں دے رہا۔ لہذا حشو ہے۔

پانچویں غلطی یہ کہ مصرعۂ اولیٰ کا قافیہ بندگی ہے اور مصرعۂ ثانی کا قافیہ زندگی۔ چنانچہ یہ قوافی معنوی حیثیت سے ایطاء کی تعریف میں آگئے۔

اب آپ نے اندازہ لگایا کہ یہ اغلاط کے صنائع وبدائع اردو ادب کو کس قدر بامِ عروج پر پہنچا سکتے ہیں۔

اور سنئے دہلی کے ایک موقر دوماہہ پرچے کے اگست نمبر میں صفحہ ۲۹ کالم ملا پر ایک نظم بعنوان ... "کے خط" کے جواب میں شائع ہوئی ہے۔

مذکورہ پرچے کے مدیر اور نظم کے مصنف بفضلہٖ دونوں آنرز ہیں۔ قدرتی طور پر انہیں اردو ادب اور مشرقی شاعری کے قواعد اور ضوابط سے بے بہرہ ہونا چاہئے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کے مدیر صاحب تحریر، تقریر اور عمل تینوں حیثیتوں سے بارہا بتا چکے ہیں۔ کہ میں شاعری سے کوئی دلچسپی رکھتا ہوں نہ شاعری کے قواعد وضوابط جانتا ہوں۔ مگر ہم اس عذر کو اس وقت تک تسلیم نہیں کر سکتے جب تک کہ اس پرچے سے حصۂ نظم ہمیشہ کے لئے خارج نہ کر دیا جائے اور صرف نثر کے مضامین چھپیں یا نظم کا حصہ کسی واقفِ فن شاعر سے ایڈیٹ کرایا جائے۔ اگر ان دونوں امور کے خلاف کوئی تیسرا امر رہا تو یہ خدمتِ اردو نہیں بلکہ اردو دشمنی ہے۔

جس نظم کا میں ذکر کر رہا ہوں۔ اس کے مصنف کوئی غیر معروف اور مبتدی گریجویٹ ہیں۔ کالج کے بہت سے مشاغل میں سے ایک مشغلہ یہ بھی ہوا کرتا ہے۔ کہ شعر کہو۔ مگر بقدرِ فیشن۔ اور لہو لگا کر شہیدوں میں ملجاؤ۔ معلوم ہوتا ہے انہیں مشاغل کا پس خوردہ یہ نظم بھی ہے۔ اس میں زبان۔ بیان، متروکات تسلسل۔ قوافی۔ موزونیت ناموزونیت اور شتر گربگی کی اول سے آخر تک قلابازیاں اور بدحواسیاں ہیں دو تین شعر ملاحظہ ہوں ؎

نامۂ شوق ترا آج مجھے، آن ملا جان پہچان کے انداز میں انجان ملا

محوِ حیرت ہوں کہ کس طرح لکھوں اس کا جواب دستِ زاہد کو سکھاؤں میں طلب شراب

تم مجھے یاد دلاتی ہو وہ برسات کی رات پیرِ میخانہ کو بھولے گی خرابات کی رات

منہدم ماضی پہ اٹھتی نہیں تعمیر کوئی عشق وہ خواب ہے جس کی نہیں تعبیر کوئی

پہلے مصرع میں لفظ "آن" بے معنی ہے۔ کیونکہ نامہ محبوب/محبوب نہیں۔ جو خود آن ملے۔ یہ غیر ذی روح چیز ہے۔ کسی کی معرفت ملا کرتی ہے نہ کہ خود۔ دوسرے مصرع میں بھی یہی عیب ہے۔ نامہ کوئی انسان نہیں جس کو اپنے اور بے گانے کی تمیز ہو۔

دوسرے شعر کے دوسرے مصرعے میں مہملیت کے علاوہ لفظ "طلب" بھی قابلِ غور ہے۔ یہ لفظ بہ تسکین ثانی ہے نہ کہ بہ حرکتِ ثانی۔ اس کا وزن اَدَب۔ غَضَب وغیرہ ہے۔ مگر نظم کیا ہے۔ ثاب قُلب کے وزن پر۔

تیسرے شعر میں محبوب کو تم یعنی تعظیم سے مخاطب کیا ہے۔ اور اس سے ابتدائی اشعار میں تیرا۔ تو یعنی تحقیر سے مخاطب ہے۔ جس سے شتر گربگی پیدا ہوگئی۔

چوتھے شعر میں ماضی کی یا وزن سے ساقط ہے۔ جس سے مصرعہ ناموزوں ہوگیا۔ باقی ماندہ اشعار میں متواتر معائب ہیں۔ مثلاً تلک۔ اوس کا قافیہ افسوس اور جذبات کا مسل رکھنا وغیرہ وغیرہ ایسی ایسی خلاف محاورہ اور خلاف اصول غلطیاں بے شمار ہیں۔

ضرورت ہے کہ ایسے مبتدیوں اور مشاعرے کے شاعروں سے دامنِ صحافت پاک رکھا جائے۔ میں پھر کہوں گا کہ یہ کام بالغ نظر ایڈیٹروں کا ہے۔ وہ ایڈیٹر جو اس فنی جانچ پڑتال کے اہل نہیں ہیں انہیں چاہئے کہ حصۂ نظم کی ترتیب و تہذیب اور انتخاب کسی واقفِ فن کے سپرد کریں۔ اس کے بعد اپنے جرائد کے صفحات پر جگہ دیں۔ غلط گو شاعروں سے زیادہ اردو ادب کی تباہی کا الزام مدیرانِ صحائف پر عائد آتا ہے۔ اور انہیں کی وجہ سے بد ترین ادب اور غلط اردو عوام میں رواج پاتی ہے۔

اسی دہلی کے ایک نوزائدہ پرچے میں میری نظر سے ایک نعت گذری جو مطلع سے مقطعے تک تمام ناموزوں، ایک مصرعہ بھی کسی مروجہ وزن میں موزوں نہیں۔ اس نعت کے مشتے نمونے از خروارے۔ دو شعر درج کرتا ہوں ؎

جن کا ہے طیبہ مقام، ان پہ درود اور سلام — جو ہیں رسولِ انام، ان پہ درود اور سلام

جو ہیں شہِ دوسرا، جو ہیں حبیبِ خدا — جن کی دنیا غلام، ان پہ درود اور سلام

میرے خیال سے یہ نعت بحر رجز مثمن مطوی مخبون میں کہتے کہتے شاعر گلے بازی کی بدولت بہک گیا۔ کیوں کہ اس کا دوسرا ٹکڑا ردیف و قافیے کے ساتھ اس وزن پر بالکل صحیح اترتا ہے۔ رہا اسی مصرعے کا پہلا ٹکڑا اور مصرعۂ اولیٰ۔ تو ان کا کوئی وزن نہیں اس وزن کے ارکان یہ ہیں۔

مفتعلن، مفاعلن، مفتعلن، مفاعلن،

اب تقطیع کی جاتی ہے۔ تو نظم نثر نظر آتی ہے۔ حالانکہ یہ وزن عام اور نہایت مروج ہے، پھر بھی کوئی مصرعہ موزوں نہیں۔ اور یہ اس وجہ سے کہ ایک تو شاعر نا واقفِ فن، نو آموز، دوسرے گویا: ظاہر ہے کہ اشعار گنگنانے اور گانے سے بمشکل موزوں ہوتے ہیں۔ ہر مصرعے میں ایک دو رکن کی بیشی آواز کے زیر و بم کی وجہ سے واقع ہو جاتی ہے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی نثر کے ٹکڑے کو تا دیر گنگنایئے تو وہ نثر کا ٹکڑا اس قدر طبیعت میں رچ جاتا ہے۔ کہ خواہ مخواہ اس پر کسی وزن کا گمان ہونے لگتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس نثر کے ٹکڑے کے ہم وزن اور بھی بہت سے نثر کے ٹکڑے تجویز کر لئے جاتے ہیں اور یہ ایک مطبوع وزن معلوم ہوتے ہیں اس گمراہ کن طریقے سے بچنے کی ایک ہی سبیل ہے۔ وہ یہ کہ کسی واقفِ فن کو ضرور اشعار دکھائے جایا کریں۔ یہ طریقہ غلط ہے کہ گا گرما ترا اور مرکی پر اشعار کا وزن کر لیتے ہیں۔ اگر کہیں سکتا معلوم ہوا تو ذرا مرکی کھینچ دی اور مصرعہ گا دیا۔

دیکھئے اللہ تعالیٰ شاعروں اور مشاعروں سے اس گانے کی لعنت کو کب دور کرتا ہے۔ مجھے قارئین معاف فرمائیں میں بہت تلخ جملہ لکھ گیا ہوں۔ اور پھر لکھتا ہوں کہ ہمارا جان سے پیارا ادب اردو گلے بازی اور ترنم کے ہاتھوں زیادہ سے زیادہ برباد ہو چکا ہے خدا کے لئے اس وبا کو رد کرنے کی کوشش کی جائے۔

خیر یہ تو ہے ہمارے ایک مبتدی اور مغرب زدہ شاعر ہیں۔ جس قدر غلطیاں کریں کم ہیں۔ مگر افسوس تو ان اساتذہ کرام اور واقفانِ

فن حضرات پر ہے۔ جو اپنی اپنی جگہ بڑے بڑے دعووں کے ساتھ پیغمبر الشعراء اور خدائے سخن بنے بیٹھے ہیں باوجود بلند بانگ دعووں کے مبتدیوں سے بدترین بدحواسیاں کر رہے ہیں اور اپنے زعم استادی میں اس قدر مست ہیں کہ اپنے ہر نیک و بد کی طرف سے آنکھیں بند کر لی ہیں۔

جولائی سنہ ۱۹۴۳ء کے ایک موقر وذمہ دار پرچے میں ایک قصیدہ نما غزل پورے صفحے پر دیکھی۔ یہ غزل بھی مذکورہ بالا بحر و وزن میں ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ مبتدی نے کہی ہے تو تمام غزل ناموزوں ہے۔ اور یہ ایک مشہور استاد نے کہی ہے اس لئے ساری غزل میں صرف تین شعر ناموزوں ہیں۔ وہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

رہ گذرِ نیاز میں اور کو بھول کر نہ دیکھ ۔۔۔ اپنا سفر تمام کر جانب ہمسفر نہ دیکھ
دیدۂ باطن اپنا کھول سالکِ خوش نگاہ بن ۔۔۔ جادۂ پرفریب میں ظاہری کر و فر نہ دیکھ
دوسرا کیوں جدا کرے تن سے ہمیں جدا کیا ۔۔۔ خنجرِ ناز کہہ گیا سر کو بشکلِ سر نہ دیکھ

اس بحر کے ارکان بالائی سطروں سے آپ نے ملاحظہ کئے ہوں گے۔ اس میں کوئی رکن "فعلن" کے وزن پر نہیں ہے۔ مگر اس غزل کے مصنف نے مذکورہ غزل کے مطلع کے مصرعۂ ثانی میں لفظ "اپنا" نظم کیا ہے۔ اور اس لفظ کا وزن "فعلن" ہے۔ اب سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کی کھپت کیوں کر ہوگی۔ اگر اس کو بجنسہ رہنے دیتے ہیں۔ تو مصرعہ بحر سے خارج اور ناموزوں ہے۔ اگر موزوں پڑھتے ہیں تو "اپنا" کا الف حذف ہوتا ہے۔ اور شاعر اپنے مرتبے میں استاد رہتا نہ رواقف کیوں کہ اردو کے اس قسم کے حروف کا دبانا اور گرانا مبتدیوں کا کام ہے۔ استادوں کا نہیں۔

دوسرا شعر بھی اسی قبیل کا ہے۔ اس کے بھی مصرعۂ ثانی میں لفظ "ظاہری" کی "یا" بالکل بحر سے خارج ہو گئی ہے۔ کیا فصحائے عرب و عجم اور کیا اہلِ ہند سب کے نزدیک عربی و فارسی کے الف۔ واؤ۔ یا حروفِ علت ہیں مگر ان کا بحر سے خارج کرنا۔ یا محذوف قرار دینا کہیں جائز نہیں اور سند کا محتاج ہے۔ اگر کہیں بحر سے خارج ہو جائیں تو متفقہ طور پر ناموزونیت کا اطلاق ہوتا ہے۔

تیسرے شعر کے پہلے مصرعے میں لفظِ "دوسرا" کا الف وزن سے نکل گیا۔ جس سے مصرعہ ناموزوں ہو گیا۔

ان مثالوں سے میرا مقصد خدانخواستہ دل آزاری نہیں بلکہ میں اپنے ملک کے اساتذہ اور مبتدی دونوں کو برسرِ اصلاح۔ اور مودبا اصلاح دیکھ کر خوش ہوتا ہوں مجھے اس وقت انتہائی رنج ہوتا ہے جب کسی ذمہ دار شاعر کے ہاں ناقابلِ تلافی فروگذاشتیں نظر آتی ہیں رہے رطب و یابس وہ تو اس مذکورہ غزل میں بے حد و بس ہیں۔ اگر ضرورت ہوئی تو کسی وقت اس پوری غزل کے معائب و اسقام پیش کروں گا یہ ایک ایسے استاد کی غزل ہے جس کے سینکڑوں شاگرد ہیں۔ کئی دیوانوں کا مصنف ہے۔ نیز سہل الممتنع کہنے اور آسان زبان میں عام مضامین نظم کرنے کی وجہ سے ملک میں کافی مشہور بھی ہے۔ مگر مذکورہ غزل کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ یہ الجھا ہوا اندازِ بیاں غلط تراکیب اور اٹکل سے چند مضامین کہاں سے سوجھے اور اس کہن سالی میں کس کی تقلید اختیار کی گانے والے شعراء میں اکثر یہ عیب بھی دیکھا گیا ہے کہ الجھے ہوئے۔ اور مہمل اشعار عموماً کہتے ہیں۔ اور گانے کی وجہ سے مشاعرے میں داد لے جاتے ہیں۔ مگر یہ مؤخر الذکر پیر کہن شاعر تو تحت اللفظ پڑھتے ہیں۔ اور بہت اچھا پڑھتے ہیں۔ پھر مہمل اور ناموزوں کہنے کی کیا ضرورت پیش آئی۔

آخر میں میری مصلحین ادب سے درخواست ہے کہ جہاں کہیں ایسے معائب اور غلطیاں پرورش پائیں یا نظر آئیں۔ اپنی پہلی فرصت میں زبان و قلم کو جنبش دیں اور ملک کو متنبہ کریں۔ میں خود بھی خطا و نسیان کا پتلا ہوں۔ ممکن ہے۔ میرے زبان و بیان میں زیادتیاں اور اسقام ہوں۔ کیا اچھا ہو کہ مجھے بے تکلف مطلع کیا جائے۔ اس وقت اردو علم و ادب اساتینِ ادب کی اصلاحی توجہات کا محتاج

محتاج ہے، میں چاہتا ہوں اصلاح زبان و ادب میں کسی کی رو رعایت سے کام نہ لیا جائے۔ نہ کسی کی شخصیت و شہرت سے مرعوب ہونا چاہیے

ادبی خدمات اور اصلاحی و تنقیدی مضامین کی اشاعت کوئی صحافتی جرم نہیں اس لحاظ سے "الہام" کے صفحات چشم براہ ہیں۔ اور

صلائے عام ہے، یاران نکتہ داں کیلئے

(شہاب)

انتخاب مشاعرہ سرکارِ ٹونک

منعقدہ ۲۶ رجولائی سنہ ۱۹۴۶ء یوم جمعہ وقت بعد نمازِ جمعہ، نظر باغ، ریاست ٹونک

مصرع طرح: عدم تک سب وفا چرچا ہے، تیری بے وفائی کا

بتقریب ورود خیام الہند حضرت حیدر دہلوی مدظلہ العالی

بحمد اللہ کہ اس گئے گذرے زمانے میں بھی ایسی علم نواز وادب پرور ذات والا صفات ملک کے ایک گوشے میں جلوہ افروز ہے کہ جس کے وجود مبارک سے ہمیشہ علوم وفنوں کو ترقی اور اہل کمال کو عزت و عظمت لابدی ہے۔ چنانچہ خیام الہند حضرت حیدر دہلوی کی تشریف آوری کی تقریب میں سرکار والا تبار نے بنفسِ نفیس ایک طرحی مجلسِ مشاعرہ کے انعقاد کا فرمان جاری فرمایا۔ اور نظر باغ کی بارہ دری میں وقت مقررہ پر مع عمال ریاست صاحبزادگانِ اعلیحضرت دام اقبالہٗ کا نزول اجلال ہوا۔

خوش فکر اور کہنہ مشق مقامی شعراء کے بعد اعلیٰ حضرت دام اقبالہٗ نے نہایت توجہ خسروانہ سے حضرت خیام الہند کا کلام طرحی و غیر طرحی نیز رباعیات سماعت فرمائیں۔ اور وہ ناقابل بیان اہمیتِ شاہانہ دی کہ بیان میں نہیں لائی جاسکتی۔

آخر میں افضل الشعراء حضرت حیدر مدظلہٗ نے اعلیحضرت دام اقبالہٗ کی طرحی غزل نہایت عمدگی سے پڑھی اور تمام حاضرین کو خوب خوب محظوظ فرمایا

تمام ارکان ادارہ حیدری اور کارپردازانِ الہام اعلیحضرت دام اقبالہٗ کے شکر گذار اور ممنون احسان ہیں کہ قدر گوہر شاہ داند یا بداند جوہری کے مصداق حضرت خیام الہند کی قدر افزائی فرمائی۔

انور حیدری دہلوی

از دہ اعلیحضرت قدر قدرت سعید الدولہ امیر الملک نواب محمد سعادت علیخاں صاحب بہادر مختار جی سی آئی فرمانروائے ٹونک دام اقبالہٗ۔

قبول اس کے کرم نے کرلیا سجدہ ریائی کا — نتیجہ ورنہ اک داغ سیہ تھا جبہہ سائی کا

کہا ہنس کر اسی منہ سے تھا دعویٰ آشنائی کا — اسی ... اسی منہ سے ہے رونا بیوفائی کا

انہیں دیکھا تو پھر بار اور دیکھا لب کشائی کا — حقیقت ... شاہد ہے اک منظر تھا وصائی کا

ادھر ہر ذرۂ بے بصر کو ... قابل نہیں رکھا — ادھر ہر چیز میں اعلان ہے جلوہ نمائی کا

وہ پہلے اپنا دل دیتے ہیں جس کے دل کو لینا ہو — زمانہ سے نرالا ہے طریقہ دلربائی کا

یہاں تو ہائے بندگی بھی سخت مشکل ہے — ہیں ایسے بھی جنہیں آسان ہو دعویٰ خدائی کا

جہاں اہل رسوخ و دور افتادہ برابر ہوں — وہاں فخر رسائی کیا، گلہ کیا نارسائی کا

خدا بننے کو کافی ہے اگر صورت کی یکتائی — بڑا زریں موقع ہے، کرو دعویٰ خدائی کا

نہ چھوڑوں گا تمہارے ہاتھ کو اب میں نہ چھوڑونگا — کہ نکلا ہاتھ اور خالی ہوا کاسہ گدائی کا

الٰہی! نامۂ اعمال سے پہلے، مری سن لے — زمانہ جس طرح بھی کٹ سکا، کاٹا جدائی کا

فدائی میں ہوں اے مختار جان و دل سے ایمانؔ
حسین ابن علی تو حید کے سچے فدائی کا

خیام الہند حضرت حیدر دہلوی مدظلہ

اثر آنکھوں پہ کیا ہوگا تری جلوہ نمائی کا — کہ میں نے منہ لگا رکھا ہے تو شام جدائی کا
تماشا آئینہ دیکھے تمہاری خود نمائی کا — معاذ اللہ کیا عالم ہے دیدہ کی صفائی کا
متاع دل لٹا کر قدر دل معلوم ہوتی ہے — میں رستہ رہزنوں سے سیکھتا ہوں رہنمائی کا
کسی کافر نے وقت صبح لی تھی نیم انگڑائی — مکمل عکس ہے مہر فلک دست حنائی کا
دل آزاروں کے حق میں بھی دعا دل سے نکلتی ہے — نتیجہ اخذ کرتا ہوں برائی سے بھلائی کا
چمن میں تو ہے جب تک کوئی غنچہ کھل نہیں سکتا — تری موجودگی میں کس کو دعویٰ دلکشائی کا
کہیں اہل نظر مایوس نظارہ نہ ہو جائیں — تکلف برطرف اب عزم کر جلوہ نمائی کا
بہار آتے ہی ہمدم قفس کی بندشیں بڑھتی ہیں — چمن والو رواج اچھا نہیں نغمہ سرائی کا
سرائے دہر میں پرسش پہ میری بدگمانی کو ہے — میں غربت میں سہارا چاہتا ہوں آشنائی کا
ملا جب کے نظر کیا سینہ چاکان چمن تجھ سے — کہ ہر گل زخم خوردہ ہے تری تیغ آزمائی کا
خدا ملنے کے کل گھر میں ذریعہ ڈھونڈنے والے — ذریعہ خود نکل آتا ہے منزل تک رسائی کا

قفس کی تیلیاں حیدر رگ تن ہوتی جاتی ہیں
لرز جاتا ہوں جس دن ذکر آتا ہے رہائی کا

سفیر الملک معتمد جنگ خاں صاحب حامد علی خاں صاحب حامد حیدری رجسٹرار سکریٹری ٹونک

اگر اپنے قفس سے مل گیا موقع رہائی کا — قیامت تک نہ لینگے نام ہم بھی خوشنوائی کا
تمہارا رنگ برق طور میں یا حسن تاباں میں بھی — جہاں بھی ہے نیا انداز ہے جلوہ نمائی کا
اسے بیگانہ دنیا آشنا رہنا ہی زیبا ہے — ہے دھبہ حسن کے دامن پہ عالم آشنائی کا
تمہاری بزم میں ہم بینوا آئیں تو کیا آئیں — طاقت ضبط شیون کی نہ یارا لب کشائی کا
ہمارے داغ دل کا دوسرا بھی نام ہے سینئے — گل خنداں اسے کہتے ہیں شاخ آشنائی کا
ہمیشہ خوش رکھا سرکار کی ذرہ نوازی نے — صلہ ملتا رہا اکثر مجھے فرض آشنائی کا
بسر ہوتی ہے حامد زندگی آرام و عزت سے — یہ صدقہ ہے فقط سرکار کی مدحت سرائی کا

شاعر محبت جناب بسمل سعیدی ہاشمی، ٹونکی

ہر چند نہیں ٹونک میں وہ قحط رجال — ایسے بھی ہیں رکھتے جو نہیں اپنی مثال
ہے قدر شناسی سعادت کا طفیل — گر ٹونک میں آجائے کوئی اہل کمال

بہ جنبد شعر گویاں سرور آمد — بہ خیل اہل عرفاں برتر آمد
مبارکباد احباب سخن سنج — خیام العصر حضرت حیدر آمد

کوئی عالم نہیں جس میں محبت کی جدائی کا — مرا ہر حال اک عالم ہے اسکی دلربائی کا
یہ عالم ہے کسی کے حسن کی نازک ادائی کا — مجھے احساس مشکل ہے ستم کی ناروائی کا
محبت کے نہایت نازک احساسات ہوتے ہیں — شکست گل سے بھی ہوتا ہے دھوکا جگ ہنسائی کا
شروع عشق میں گویا وفائیں بھی گزری تھیں — کیا کچھ اسطرح اب عذر اس نے بیوفائی کا
کسی کے دل میں رہ کر بھی کوئی محسوس کرتا ہے — محبت میں یہ اک عالم بھی ہوتا ہے جدائی کا
جو ناکردہ گنہ کیطرح باقی کوئی رہ جائے — وہی سجدہ ہے کرے در پہ حاصل جبہ سائی کا
معاذ اللہ شیخ و برہمن کا ظاہر و باطن — گناہوں نے جنہیں کہلا ہے جامہ پارسائی کا
گنہگاری میری عین مشیت ہے مگر بسمل — مجھے باغی کہا جاتا ہے احکام خدائی کا

صاحبزادہ محمد شفیق الرحمن صاحب شفیق سیمابی ٹونکی

ہوا کچھ اور طوفانی سمندر خود نمائی کا — خدا جانے کیا تم کو نے دعویٰ آشنائی کا
وہی کچھ آشنائے منزل مقصود ہے شاید — رسائی پر بھی ہے اقرار جسکو نارسائی کا
یہ نظریں جاذب و رعنا یہ آنکھیں ساغر و مینا — زمانے نے چلن سیکھا ہے تجھ سے دلربائی کا
کسی کو اسنے دنیا دی کسی کو دین کی دولت — مجھے سب کے عوض غم دیدیا ساری خدائی کا
تری ہستی اگر صرف اک فریب غیر مختتم ہے — تو عالم منتظر کیوں ہے تری جلوہ نمائی کا
تو پھر ہو تو میں اپنے کو کیوں برباد کر ڈالوں — مری وحشت نتیجہ ہے تری بے اعتنائی کا
شفیق بے مہری عالم کا دل سے مٹ گیا شکوہ — وفا والوں میں جب سے رنگ دیکھا بیوفائی کا

جناب عبد اللہ صاحب رضا، ٹونکی

شب نزدیک ہوتا ہے وہی لمحہ جدائی کا — خیال آجائے جب اسکی کسی بے اعتنائی کا
یہ کیا انداز ہے اے عشوہ گر جلوہ نمائی کا — کہ دم آنکھوں میں کھنچکر آگیا ساری خدائی کا
معاذ اللہ جذبات آفرینی ان نگاہوں کی — زباں تک آکے رک جاتا ہے دعویٰ پارسائی کا
جبیں کی بات ہے انکے در پہ پیشانی زہے قسمت — سلامت وعدہ بڑھ جاتا ہے شوق جبہ سائی کا
زہے تاثیر چشم لطف یہ معلوم ہوتا ہے — اٹھایا ہی نہیں جیسے کبھی صدمہ جدائی کا
رہی پابندیٔ ذوق فغاں سل گئے گویا — زباں تک رہ گیا آکر جو شکوہ بیوفائی کا
حجاب اٹھنے کے قابل آج تو کچھ ہے جانے میں — مرا ارماں تماشا یہ تقاضا خود نمائی کا
رضا اس آنکھ سے اب اسکی ہم دشتی دیکھیں — رکھا کرتے تھے جو الزام مجھ پر بے وفائی کا

جناب مہتف ٹونکی

عنایت سے دیا انسان کو ذوق آشنائی کا — کوئی کیا ناز اٹھا سکتا ہے اسکی کبریائی کا
سر تسلیم خم ہو کس لئے مخلوق کے آگے — خدا کو چھوڑ کر بندہ بنوں کیوں کر خدائی کا
خدا بننا کہاں بندہ ہی بننا سخت مشکل ہے — قیامت ہے اگر بندہ کرے دعویٰ خدائی کا

عجب کیا چپ ہو کچھ بالم قید غم الفت   تصور ہوں کرتے نہیں آتا رہائی کا
گرے جاتے ہیں خوشی سے خود بخود سجدے   پہنکے در پہ پہنچا شوق لیکر جبہ سائی کا
ذرا بھی الفت ہوتا غلام جذبے نیاز عشق   یہ انکی مہربانی ہے جو غم دیں آشنائی کا
بلا پلا کر خاموشی بھی اے سیفؔ الفت میں   گردیں ہے برپا تلاطم آشنائی کا

حسین الدین صاحب فوقؔ جامی ٹونکی

بیاں ہو وصف کس منہ سے تری تیغ آزمائی کا   ابھی تک ہے نشاں لپہرے نازک کلائی کا
بھلا قسمت کا شکوہ کیوں مقدر کی شکایت کیا   گلہ میری زباں سے اور تمہاری بیوفائی کا
مرا انصاف اور دشمن کے ہاتھوں کیا قیامت ہے   ہمنوائی کا طریقہ ہے کہ یہ باہم لڑائی کا
خدا کیواسطے ناصح نصیحت اپنی رہنے دے   مجھے احساس ہے اپنی برائی اور بھلائی کا
نگاہ مست ساقی دیکھتے ہی ہوش کھو بیٹھا   بہت دعوی کیا کرتا تھا زاہد پارسائی کا
رہائی کی کروں درخواست کیا صیاد سے ہمدم   اجل ہے آئیگی خود ایکدن نامہ رہائی کا
دل صد چاک نے حالات لکھے فوقؔ شکوے   لیا خون جگر سے کام ہمنے روشنائی کا

جناب حامد سعید خانصاحب ساحلؔ ٹونکی

وہ لیکر کیا کریگا سیم و زر ساری خدائی کا   شرف حاصل ہو جسکو اک ترے در کی گدائی کا
نہ پوچھو حال منزل تک رسائی نارسائی کا   نشاں ہے نقش ۔۔۔ ہے پر ہمارے جبہ سائی کا
نہیں معلوم کیونکر ابتدائے عشق ہوتی ہے   نہ جانے کس طرح آغاز ہوتا ہے جدائی کا
مقرر وقت و موقع ہے نہ تخصیص مکاں کوئی   یہ کیا انداز ہے آخر تری جلوہ نمائی کا
کبھی جو طعنہ زن تھے میرے جذبات محبت پر   انہیں ہونا پڑا قائل محبت کی خدائی کا
فراوانی ہیں انبوہ الم کی کچھ کمی فرما   کلیجہ پھٹ نہ جائے ایکدن تیرے فدائی کا
نہ سنگ در کی حاجت ہے نہ نقش پا مرے دیں ہے   مذاق اب اور ہی کچھ ہے ہماری جبہ سائی کا
یہ میخانہ ہے بس خاموش ہی بیٹھے رہو ساحلؔ   کہیں عقدہ نہ کھلجائے تمہاری پارسائی کا

جناب احمد خاں صاحب عیشؔ، ٹونکی

اشارہ ہے قدم بوسی در جاناں پر رسائی کا   یہی صورت سہی نکلے تو ارماں جبہ سائی کا
گلہ ظلم و ستم کا ہے نہ شکوہ بیوفائی کا   خدا تو ہے میں بندہ ہوں محبت کی خدائی کا
ابھی پیش نظر حالت ہے منزل پر پہنچنے کی   اٹھا ہوں پھر بھلا ایسے شرم نارسائی کا
عبث شرمندگی ہے ذکر وصل غیر پر اتنی   دل ناکام شاہد ہے تمہاری پارسائی کا
مرے صیاد نے ہر اک زمانہ میرا دیکھا ہے   قفس کی نوحہ خوانی کا چمن کی خوش نوائی کا
ثبوت شان یکتائی ترے صدقے ترے قرباں   ہزاروں مرنیوالے کر گئے دعوی خدائی کا
نگاہوں میں نگاہ عیشؔ جم گئی ترے محبت میں   سمجھ لوں کسطرح اپنا سا دل ساری خدائی کا

جناب نازؔ صاحب ٹونکی

تو تم میں نہیں رکھتا وجود ما سوائی کا   مسلماں اسکی خلوت کا ہوں کافر ہوں خدائی کا
مٹاتے ہو اسے جسکو غم بے انتہائی کا   نہ دیکھا خواب میں دیکھی جو پرنے منہ دکھائی کا
نہیں آزاد تم سے ستیزہ تو پھر تڑپے تو بیکس ہیں   بھلائی جب برائی ہو تو کہنا کیا برائی کا
وہ بلبل ہوں باغیرس بہاں ہیں مس فغاں میں بس   چمن میں معترف ہر گل ہے میری خوش نوائی کا
رہیگا خاک کر کے اک نہ اک دن خرمن ہستی   الم نا آشنائی کا قلق شام جدائی کا
خلاف وعدہ اری بت پرستی کسطرح چھوڑیں   برا خود ہوں تو دامن چھوڑ دوں کیسے برائی کا
خدا کے دیکھنے والے خدا کو دیکھ سکتے ہیں   اٹھا کر دیکھ آنکھوں سے خدا پردہ خدائی کا
یہ درد دل بجز انساں کسیکو بھی نہیں ملتا   پھریں شمس و قمر لیکر اگر کاسہ گدائی کا
بنا سکتا ہے وہ اے نازؔ ہر نقش پا کعبہ   شرف حاصل ہے جسکو آپکے در کی جبہ سائی کا

جناب صولتؔ ٹونکی

خدا کا شکر ہے غم اب نہیں بے دست و پائی کا   ہے اب لطف شہی سے حوصلہ نبرد آزمائی کا
کیا سرکار نے آزاد قید رنج و حرماں سے   وظیفہ ہو گیا جاری گیا غم سب بے نوائی کا
فقط آنکھوں ہی کی اب رہ گئی ہے سیج بیاں باقی   شہ والا شاہ دیجے یہ حکم بھی اس فدائی کا
میری اگلی وہ تنخواہیں بھی شاہا مجھکو ملجائیں   کہ رفع دور ہو جائے یہ سارا سب بے نوائی کا
نگاہ خسروی کے اک اشارہ کی ضرورت ہے   حساب الکشت ہو جائیگا میری پائی پائی کا
نکالے دو دبتوں کو کون بحر غم سے جز تیرے   خدا نے تجھکو بدلہ دیا ہے ناخدائی کا
خدا زندہ رکھے سرکار والا جاہ کو صولتؔ   انہیں کا دم تھے حق میں ہے سب کی ہر بھلائی کا

جناب شکورؔ ٹونکی

نہ چھوڑا اس ستمگر نے طریقہ بے وفائی کا   گوارا ہے ہمیں اب رنج ترک آشنائی کا
مصیبت سی مصیبت ہے قیامت ہی قیامت ہے   دکھائے منہ نہ دشمن کو خدا شام جدائی کا
اسے الزام دیتا ہوں تو دل انصاف کرتا ہے   حسینوں کو ازل سے شوق ہے صبر آزمائی کا
اگر سچ ہے وہ روٹھے ہیں بگڑ کر بزم دشمن سے   تو پھر اے جذب دل موقع ہے قسمت آزمائی کا
یہ ضد ہے پھر اسے دہلیز پر اپنے نہیں رکھا   نشاں جس سنگ در پہ دیکھا میری جبہ سائی کا
یہ نخوت یہ تنفر یہ تکبر کس کو زیبا ہے   بتو آخر خدا کو بھی خدا سمجھو خدائی کا
نہ وہ دل ہے نہ وہ دل ہے یوں خوش ہے تیوری پر   شکورؔ اب کیا کروں آخر علاج اس کی جفا کا

جناب احمد خانصاحب نازشؔ ٹونکی

الٰہی ہوں شکایت سنج آلام جدائی کا   ہے شہرہ لامکاں تک میرے نالوں کی رسائی کا
حجاب کنت کنزاً مخفیاً سے خود نکل آیا   محبت بنگئی آخر کو باعث خود نمائی کا

حسینوں پر نگاہِ شوق ہرگز پڑ نہیں سکتی   کہ ہے پیشِ نظر نقشہ کسی کی خوش ادائی کا
کوئی بگڑے ہے بنتا ہے کوئی بنکر بگڑتا ہے   یہ کیوں فساد کا سلسلہ مدہ رسائی کا
وہ اب خود منگتے ہیں تاج شاہی کیوں نہ ٹھکرائے   مزہ لگ گیا ہے جسکو تیرے در کی جبہ سائی کا
ہمارا استقلال اب داخلِ جور و ستم ہوگا   زمانہ ہو چکا ہے ختم الفت آزمائی کا
رہِ مہر و لغزش ناصح ادھر شیطان رہزن ہے   مدد خضرِ طریقت وقت ہے یہ رہنمائی کا
سبب انشا پردازِ عشق کا خط و کتابت ہے   بنا ہے اضطرابِ شوق باعث خامہ سائی کا
غزل ہو گوش پاک ہشیار سرکارِ عالی کی   ہے جسمیں رنگ خاقانی و سعدی و سنائی کا

محمد عبد المنعم خانصاحب منعم ٹونکی

رہیگا ایکدن احساس کہ یہ شہرہ پارسائی کا   ترقی پر اگر جذبہ رہا جلوہ نمائی کا
میں اپنے عشق کے نشہ میں خود مخمور رہتا ہوں   مجھے ہوگا بھلا شکوہ تری بے اعتنائی کا
رسائی بزم میں جلتی ہو تالاں ہیں تلون سے   تو پھر بیفائدہ ہے رنج اپنی نارسائی کا
نہیں ہیں اور اب دشواریاں راہِ محبت کی   کہ وہ ثمرہ وفا کا ہے جو ہوتا بیوفائی کا
بہت مدت ہوئی چھوڑے ہوئے امیدوار دلکو   کہ وہ تو اقتضا تھا اس مذاقِ ابتدائی کا
ہمیں واماندگی سے ہاتھ آئی منزلِ مقصد   کرم ہے شوقِ منزل پر ہماری خستہ پائی کا
کہو تو آج یہ تم اسطرف کیسے چلے آئے   تمہیں تو زعم تھا ٹونکی میری نارسائی کا
مجھے اب حادثات دہر سے ایذا نہیں ہوتی   بہت ممنون ہوں دل کے غم لا انتہائی کا
کسی نے جب ترا اپنا سا ارمان نام رکھا ہے   تو پھر شکوہ ہے کیا ٹونکی منعم نارسائی کا

جناب ضابط ٹونکی

مجھے ہے آجتک رونا اسی کی بے وفائی کا   کہ جسکے پیچھے دشمن بن چکا ساری خدائی کا
نہیں کم ہمتی کے طعنے یہ کیسے گوارا ہو   ابھی تو حوصلہ باقی ہے قسمت آزمائی کا
دیا ہے عشق طینت میں محبت بیوفائی دی   اٹھیگا کیسے اے اللہ یہ صدمہ جدائی کا
سحر بھی ہو گئی لو شام سے وہ بات اتنی تھی   کہ ہم کہنے لگے تھے وصل میں قصہ جدائی کا
قدم پڑنے لگے اس آستانہ پر جو غیروں کے   مزا جاتا رہا اب آستاں پر جبہ سائی کا

جناب واصف ٹونکی

جفائی تجھ سے شکایت ہے نہ شکوہ بیوفائی کا   مرے نزدیک تو انداز ہے یہ دلربائی کا
یہ مانا اچھی صورت میں وفا ہوتی نہیں لیکن   ابھی انجام بھی سوچا ہے تم نے بے وفائی کا
جدائی کا کرے جو عشق میں شکوہ وہ ناقص ہے   کبھی موقع نہیں ملتا محبت میں جدائی کا
جو رو دیتا ہوں تو یہ کہکر مجھے وہ ٹوک دیتے ہیں   نتیجہ بھی تمہیں معلوم ہے اس جگ ہنسائی کا
کسی کے سنگِ در تک ہی جبیں آ کر پہنچ جائے   یوں ہی موقع ملے اے کاش قسمت آزمائی کا

جناب عیش ٹونکی

خدائی تجھ کو زیبا ہے تو مالک ہے خدائی کا   ہوا ہے معترف ہر ایک تیری کبریائی کا
چلن سیکھا ہے کس سے یہ بتو یہ دلربائی کا   لبھا لیتے ہو دل اک آن میں ساری خدائی کا
وفا کرنے پہ بھی لکھا گلہ ہے بے وفائی کا   نتیجہ پا رہے ہیں ہم بھلائی میں برائی کا
تری توصیف میں گر ساری دنیا بھی زباں کھولے   تو اک شمہ ادا ہرگز نہ ہو تیری بڑائی کا
بجز تیرے پکاروں کس کو اور کس سے کروں یا رب   تجھے معلوم ہے سب حال میری بے نوائی کا
ہزاروں واقعات اے عیش اس دنیا میں گذرے ہیں   ہوا ہے مرتبہ شاہوں کو بھی حاصل گدائی کا

حسینوں سے ہو امیدِ وفا، یہ غیر ممکن ہے
گلہ کرنا عبث ہے عیش ان کی بے وفائی کا



Regd. L. No. 4642

ماہنامہ

الہام

مدیر
شہاب دہلوی

قیمت سالانہ عہ

قیمت فی کاپی ۳ر

دارالاشاعت

ادارۂ حیدری جامع مسجد دہلی

Per copy As. 3

Annual Rs.2

نرخنامہ اشتہارات متعلقہ الہام دہلی

صفحات کی تعداد	ایک اشاعت	تین اشاعت	چھ اشاعت	بارہ اشاعت
صفحہ ٹائیٹل پورا	صہ ۱۵/	للعہ ۴/	معہ/	ماعہ ۱۲۵/
〃 〃 نصف	مہ ۸/	عہ ۲۰/	بہ ۳۰/	صہ ۶۵/
〃 〃 چوتھائی	للعہ ۸	عہ ۱۲/	عمہ ۲۰/	صہ ۳۵/
〃 معمولی پورا	عہ ۱۰/	عہ ۲۵/	للعہ ۴۵/	لہ ۸۰/
〃 〃 نصف	صہ ۸	عہ ۱۵/	عہ ۳۵/	للعہ ۴۵
〃 〃 چوتھائی	سے ۳	مہ ۸/	صہ ۱۵/	عہ ۲۵/

نوٹ فی انچ فی کالم عہ/ اندرون دہلی سے اجرت اشتہار نصف پیشگی اور بیرون دہلی سے پوری اجرت اشتہار پیشگی مزید معلومات دفتر الہام سے حاصل کیجئے۔

منیجر

مجلہ الہام دہلی

قیمت سالانہ عہ
ششماہی عہ
رؤسا سے
والیان ریاست سے
غیر ممالک سے چھ شلنگ

مدیر
شہاب دہلوی
معاون
عرش حیدری
مدیر اعزازی
منتقم۔ بی-اے

جلد ۸ — بابت ماہ جنوری سنہ ۱۹۴۱ء — نمبر ۱

نمبر شمار	مضمون	صاحب مضمون	صفحہ
۱	اسمائے گرامیِ محسنین و معاونین	------	۲
۲	گفت و شنید	شہاب دہلوی	۳
۳	ارشاداتِ عالیہ	خیام الہند حضرتِ حیدر دہلوی مدظلہٗ	۴
۴	گُنگلا	جناب محمد امین شرقپوری	۵
۵	لمعاتِ قمر	حضرتِ قمر بدایونی مدظلہٗ	۸
۶	مکتوباتِ لبیب	جناب عرش تیموری	۹
۷	شاعر۔ میری فطرت	حضرت احسان دانش	۱۳
۸	کشاکش	جناب نسیم چغتائی	۱۴
۹	سگریٹ کیس	جناب رضی الدین بی-اے	۱۷
۱۰	انسانِ کامل	حضرت نظام شاہ صاحب لبیب دہلوی	۲۴
۱۱	عہدِ رفتہ کی صدائے بازگشت	جنابِ شمیم ہاشمی لکھنوی	۲۵
۱۲	ارشادِ ارشدی	جناب محبوب الحسن ارشدی بدایونی	۲۸
۱۳	کیفِ نشاط	مسیح الکلام حکیم حضرت کیف دہلوی	۲۹
۱۴	جگنو	جناب عباس جعفری	۳۰
۱۵	رباعیات	جناب ماسٹر نصرت قریشی	۳۲
۱۶	اتھیلو	جناب منتقم بی-اے	۳۳
۱۷	مشاعرۂ ادارۂ حیدری	مختلف حضراتِ شعراء	۳۸
۱۸	تقریظ و تنقید	شہاب دہلوی	۴۴
۱۹	اشتہارات	حضراتِ مشتہرین	

سرپرست

عالیجناب نواب غازی بہادر آف گوردھا بالقابہ

۱	محسنِ الہام	مسیح الکلام جناب حکیم حاجی ہاشم جان صاحب کیف حیدری دہلوی	للعہ ۲۴
۲	محسنِ الہام	جناب محمد زبیر خاں صاحب زبیر حیدری ٹونکی	للعہ ۲۴
۳	محسنِ الہام	جناب شیخ محمد عثمان صاحب رئیس دہلی	عنہ ۲۰
۴	معاونِ الہام	جناب ماسٹر غلام عباس صاحب زاہر حیدری سانکھنوی	عہ ۱۲
۵	معاونِ الہام	جناب سید آفتاب احمد صاحب افق حیدری دہلوی	عہ ۱۲
۶	معاونِ الہام	جناب بخت لیلیٰ حیدری صاحب دنیانگری	عہ ۱۲
۷	معاونِ الہام	جناب آر مورس سنگھ صاحب عارف حیدری لدھیانوی	عہ ۱۲
۸	معاونِ الہام	جناب عبدالرشید خاں صاحب راشد حیدری دہلوی	عہ ۱۲
۹	معاونِ الہام	جناب نواب مرزا احمد علیخان صاحب تاباں حیدری دہلوی	عنہ ۱۰
۱۰	معاونِ الہام	جناب خواجہ محمد شفیع صاحب رئیس اعظم دہلی	عنہ ۱۰
۱۱	معاونِ الہام	جناب خان بہادر علامۂ عصر ذکاءاللہ صاحب بریلی	عنہ ۱۰
۱۲	معاونِ الہام	جناب شیخ محمد الیاس صاحب رانی کھیت والے رئیس اعظم دہلی	عنہ ۱۰
۱۳	ہمدردِ الہام	جناب اعجاز حسین صاحب صہبا حیدری دہلوی اترانچی	سے ۶
۱۴	ہمدردِ الہام	جناب ماسٹر غفران احمد صاحب نصرت حیدری قریشی دہلی	سے ۶
۱۵	ہمدردِ الہام	جناب بابو سجاد علی صاحب حیدری بریلوی	سے ۶
۱۶	ہمدردِ الہام	جناب اقبال صاحب ناز حیدری دہلوی	سے ۶

فروری ۱۹۴۱ء کیلئے مصرعہ طرح :- (اصلاح کے عام ہے یاران علم وفن کے لئے) فن - وطن قوافی کیلئے ردیف

گفت و شنید

لباسِ یُمن و بہجت میں الٰہی سال نو آئے ٭ بہار و لکشا لائے نوید جانفزا لائے

بحمد اللہ کہ سنہ ء ختم ہوا مگر اپنی ہلاکت خیزی و خونچکانی کے ہاتھوں انسانی تاریخ اور انسانیت کے نام پر وہ دل ہلا دینے والا اور شرمناک دھبہ چھوڑ گیا جس پر زمین و آسمان میں بسنے والی مخلوق صدیوں متاسف و متعجب رہے گی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ نئے سال کا آغاز حق و انصاف کی جیت اور اطمینان و راحت کی اساس پر ہو۔

"الہام" کا نیا سال ماہ مئی سے شروع ہوتا ہے مگر امسال میں نے مناسب سمجھا کہ دیگر رسائل کی طرح "الہام" کے بھی نئے سال کا آغاز ماہ جنوری سے متصور ہو اکرے چنانچہ الہام کا جنوری نمبر بجائے نمبر ایک ہوگا

"الہام" کی خدمات اب تک الہام نے جو قدم بڑھایا ہے ترقی کی طرف بڑھایا ہے۔ میں یہ جانتا ہوں کہ حسب خواہش مرتبے پہنچانے کیلئے کتنا وقت درکار ہے اور میری کوششیں کہاں تک مشکور ہو سکیں گی۔ اگر کاغذ کی گرانی روز بروز سدِ راہ نہ ہوتی تو میرے مجوزہ پروگرام کے مطابق "الہام" ضخامت اور دیدہ زیبی کے اعتبار سے قابلِ رشک ماہنامہ بن چکا ہوتا، ہر چند کہ موجودہ حالت میں نہایت وقیع اور ادب دہلی کا اعلیٰ معیار مانا جاتا ہے۔ صحافی اور ادبی دونوں طبقوں کے سرکردہ اور ذمہ دار اصحاب معترف ہیں کہ "الہام" اس وقت وہ معیاری و افادی ماہنامہ ہے کہ دہلی کی صحافت میں جس کی نظیر نہیں۔ بایں ہمہ میں مطمئن نہیں کیونکہ میرا مطمحِ نظر "الہام" کو منتہائے ترقی پر پہنچانا ہے۔ اگر قارئین "الہام" ذرا ادب نوازی اور علم دوستی سے پیش آئیں تو یہ کام کوئی مشکل نہیں۔ وہ اس طرح کہ "الہام" کے مستقل خریدار اپنے حلقہ احباب میں سے صرف دو دو خریدار فراہم کر دیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ میری یہ صدا۔ صدا بہ صحرا نہیں ہوگی۔ بلکہ میری درخواست اور توقع سے زیادہ حضراتِ قارئین اپنے "الہام" کو سہولتیں بہم پہنچائیں گے۔ ماہ فروری سنہ ء سے ان حضرات کے اسمائے گرامی شائع ہوتے رہیں گے جو کم سے کم دو خریداروں کا چندہ دفتر "الہام" کو روانہ فرمائیں گے۔

مشتہرین اور خریدار حضرات ہمارے نمائندے یا ایجنٹ کو بغیر رسید لئے چندہ عنایت نہ کریں ہم نے جن کو خریدار بنانے کے لئے مقرر کیا ہے انکے پاس دفتر کی مطبوعہ رسید بکیں ہیں اگر آپ نے چندہ دیکر رسید حاصل نہ کی تو دفتر "الہام" ذمہ دار نہ ہوگا۔ اسی طرح مشتہرین حضرات ایڈیٹر "الہام" کی دستخطی رسید حاصل کر کے اپنا بل ادا فرمائیں کیونکہ اکثر بے ضابطگیاں اور غبن علم میں آتے ہیں جن سے آئندہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔

شکر و شکایت میں اپنے اُن معاصرین کا ممنون اور شکر گزار ہوں جنھوں نے "الہام" سے تبادلہ منظور فرمایا اور تبصرے سے بھی دریغ نہ کیا۔ بعض معاصرین سے شدید شکایت ہے کہ چھ چھ۔ اور آٹھ۔ آٹھ ماہ سے "الہام" انہیں برابر پہنچ رہا ہے مگر سونٹھ کی ہلاس سونگھے بیٹھے ہیں یاد دہانی کے خطوط نے بھی اُن کے تمرّد اور پندارِ صحافت کو نہ توڑا۔ جنوری کا پرچہ پھر نیاز مندانہ حیثیت سے ان کی خدمت میں پیش ہوگا۔ اگر اب کے بھی نفی یا اثبات میں جواب موصول نہ ہوا تو پھر ع ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں۔

شہاب دہلوی

ارشاداتِ عالیہ

خیّام الہند حضرتِ حیدر دہلوی مدظلہٗ

ڈالو نہ نظر مہر پہ گرمائی ہوئی سی
تم برق سہی برق بھی لہرائی ہوئی سی

وہ حسنِ شگفتہ ہے بہرحال شگفتہ
جب دیکھئے ہونٹوں پہ ہنسی آئی ہوئی سی

اللہ رے وہ حسنِ جہانتاب وجہاں سوز
خیرہ ہے نظر نبض ہے تھرّائی ہوئی سی

وہ جوش لہو میں ہے کہ روکے نہیں رکتا
اب کے ہے خزاں میں بھی بہار آئی ہوئی سی

وہ ناوکِ دل دوز تو پہلو میں نہ ٹھیرا
اک لاش ملی خون میں نہلائی ہوئی سی

کیوں بند سرِ شام ہوئی جاتی ہیں آنکھیں
یہ حسن کا نشہ ہے کہ نیند آئی ہوئی سی

اِس عشق کی گستاخ نگاہی کا بُرا ہو
تو شمعِ تجلّی کی ہے تھرّائی ہوئی سی

کیوں میرے لئے گوش برآواز کوئی ہو
روداد ہوں روداد بھی دہرائی ہوئی سی

حیدر یہ قدم اور اٹھیں جانب دنیا؟
دنیا اِنہیں قدموں کی ہے ٹھکرائی ہوئی سی

کنگلا

(ایک دلگداز افسانہ)

اُسے دمہ کا عارضہ تھا، دم گھٹ کر آتا تھا، کھانستے کھانستے چہرہ سُرخ ہو جاتا، بدن کی کھال ہڈیوں کے ساتھ چپک گئی تھی گلے پچکے ہوئے تھے، اور گلے کی ہڈی باہر نکل آئی تھی، خشک چہرہ پر صرف دو موٹی موٹی آنکھیں دکھائی دیتی تھیں، وہ برسوں کا مریض تھا، جب ٹھوں ٹھوں کرتا تو معلوم ہوتا کہ ابھی زندہ ہے، وہ غریب تھا، اس کے پاس دولت نہ تھی کوئی جائداد نہ تھی، جسے بیچ کر علاج معالجہ کرتا۔ ایک ٹوٹا پھوٹا جھونپڑا تھا، مٹی کے چند برتن تھے ایک معتبر بیوی تھی اور دس برس کا لڑکا بس یہ اس کی اوقات تھی، جوانی کے دنوں میں اس نے مکر و فریب سے دولت نہیں جمع کی تھی، جو بڑھاپے کے تلخ ایام میں اسے سہارا دیتی، مصیبت کے وقت کام آتی۔ اس موذی مرض سے اُسے نجات دلاتی

آخر ایک دن وہ گھڑی بھی آگئی جس نے اُسے ہمیشہ کے لئے پاک کر دیا۔ اس نے آخری کروٹ لیتے ہوئے بیوی کو پکارا، جو سہمی ہوئی سرہانے بیٹھی تھی، "سکھیا" اس نے کھانستے ہوئے کہا۔ بیوی نے غمگین لہجہ میں کہا "کہو کیا کہتے ہو"؟

"میرا بیٹا کہاں ہے"؟ وہ اکھڑی ہوئی آواز میں بولا، گوپال باہر لڑکوں کے ساتھ کھیل رہا تھا، دس برس کا لڑکا اس پیش آنے والے حادثہ کو کیا جانے، جس کی گرفت اور سنگین ہونے والی تھی، اُسکی معصوم زندگی پر مصائب و آلام کے بادل منڈلا رہے تھے، جن کی بھیانک تاریکیوں میں اسے عمر بھر ٹھوکریں کھانی پڑینگی!

ماں نے آواز دی بیٹا مسکراتا ہوا دوڑ کر آیا، باپ نے اسے حسرت بھری نظروں سے دیکھا اور چھاتی سے لگا کر کہا۔

"بیٹا اب تم دنیا میں اکیلے رہ جاؤ گے" تمہیں کون پیار کریگا، کون چھاتی سے لگائیگا، تمہارے کھانے پینے کی فکر کسے ہوگی، اس دھرتی پر غریب ہمیشہ دکھی رہتا ہے، تمہاری ماں ہے!" وہ کہتے کہتے رک گیا، زور زور سے کھانسنے لگا، اور خاموش ہوگیا، سکھیا کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے

ماں کو روتے ہوئے دیکھ کر بیٹا بلک بلک کر رونے لگا، غم و اندوہ کے مرکز سے رونے چیخنے کی صدائیں بلند ہوئیں، آس پاس کے پڑوسیوں نے سنا تو دوڑ کر آئے، بوڑھا رام پت مُردہ پڑا تھا۔ اسکی بیوی اور بچہ رو رو کر ہلکان ہو رہے تھے، اس کے کریا کرم کے سامان کے لئے بھی گھر میں کوئی چیز نہ تھی، چند مٹی کے برتن اوندھے سیدھے پڑے تھے، مصیبت زدوں کی بے بسی کا ماتم کر رہے تھے، اُن کی قیمت ہی کیا؟ سکھیا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا، میرے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے! جانے ان لوگوں کو کیسے رحم آگیا شمشان بھومی کے ٹھیکیدار بغیر کچھ لئے کیونکر مان گئے، رام پت کی لاش کو سپرد آگ کر دیا گیا!

اس کے مرنے کے ایک سال بعد بوڑھی سکھیا بھی چل بسی، اماں کے مرنے سے گوپال کی مصیبتوں کا نیا دور شروع ہوا اب وہ اس دنیا میں اکیلا تھا۔ بے یار و مددگار! اس کا کوئی رشتہ دار نہ تھا، غریبوں کے رشتہ دار ہی کہاں ہوتے ہیں، دنیا کے تمام رشتے دولت سے وابستہ ہیں۔ جہاں یہ نہ ہو وہاں رشتہ داروں کا کیا کام؟ گوپال کے پاس کیا دھرا تھا، ماں کے ماتم کے لئے اس کے پاس چند آنسو تھے جو اس نے روتے روتے ختم کر دیئے، اسکی آنکھیں سُرخ ہو گئیں گلا بیٹھ گیا، سر اور پاؤں سے ننگا دن بھر گلیوں میں پھرتا، دنیا کو دکھانے کے لئے! دولتمندوں کو خواب خرگوش سے بیدار کرنے کے لئے! جو دولت کے نشہ میں مدہوش پڑے ہیں، اس کا گریہ پیہم پکار رہا تھا، کہ اے دنیا کے اجارہ دارو دیکھو ایک مصیبت زدہ مصیبت کے ہاتھوں غربت کے سیلاب میں بہہ رہا ہے۔

اس کے بدن پر لتے نہیں ہیں، فاقوں نے اس کا حلیہ بگاڑ دیا ہے، اس کے جسم میں چلنے کی طاقت نہیں، زبان خشک ہوگئی ہے! مگر اس دنیا میں غریبوں کی پکار کون سنتا ہے، کتنے ایسے لوگ ہیں جو کسی کی مصیبت میں کام آتے

ہیں، دُنیا نفسی نفسی کی دُھن میں مست ہے، دولت کے نشہ نے ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے، خود غرضی نے اُن کے کانوں میں روئی بھردی ہے، زاہد نے کہا کہ دُنیا میں اس کا وجود زہد و عبادت کے لئے ہے۔! دولت کا پرستار طمع ولالچ کی آگ سے جل بھن کر بولا کہ وہ دھن اکٹھا کرنے کے لئے پیدا ہوا ہے، عیاش جھومتے ہوئے بولا کہ دنیا عیش و عشرت کا نام ہے۔ ہمیں پیالہ شراب اور رنگ رلیوں سے کام ہے، دنیادار چیں بجبیں ہوکر بولا کہ اپنے بال بچّوں سے فرصت ہو تو دوسرے کی خبر لے۔ غریب نے اسے دیکھا تو دل پکڑ کر کہنے لگا، کہ غریب اس دنیا میں پیدا ہی اس لئے ہوتے ہیں کہ در در کی ٹھوکریں کھائیں، کسی کے پاس مصیبت زدہ کے لئے ہمدردی نہ تھی، سب کے خون سفید تھے۔

۲

"جنگل سے بھاگے ہوئے ہرن کی طرح گوپال بازاروں میں ہر ایک کی صورت تک رہا ہے، "میں دو روز سے بھوکا ہوں، بابو ایک پیسہ دیدو"، اس نے ایک کے آگے ہاتھ پھیلا کر کہا،

"لڑکے تمہارا سن ہی کیا ہے، ابھی سے بھیک مانگو گے تو بڑے ہوکر کیا کروگے؟" اس نے رکھائی سے کہا،

"ایک روٹی دلا دو۔! اس نے نہایت عاجزی سے ایک دوکاندار سے کہا" دن بھر روٹی، روٹی! یہ بھی کوئی وقت ہے روٹی کا تمہارا پیٹ ہے یا تنور، چل بھاگ یہاں سے۔! وہ جھڑک کر بولا، اُسے کیا معلوم کہ غریبوں کو جب ہاتھ آجائے، وہی اُن کے کھانے کا وقت ہے۔!" اجی یہ مونڈی کاٹے ایسے ہی تو بگڑتے ہیں، آج یہ بھیک مانگنے نکلا ہے کل اسے چوری کی لت پڑے گی، کسی پولیس والے سے کہہ کر اسے ریفارمیٹری اسکول میں بھجوا دو۔! ورنہ یہ ملک کے لئے بہت خطرناک ہوگا، ایک اپٹوڈیٹ جنٹلمین نے آگے بڑھ کر کہا

وہ دن بھر بازاروں میں گھومتا لوگوں کی طرح طرح کی باتیں سنتا کسی کو رحم آجاتا تو بچا کھچا ٹکڑا دیدیتا! وہ شام کو گھر لوٹ کر آتا رونے اور آہیں بھرنے کے لئے۔! مصیبتوں پر غور کرنے کے لئے، جو عمر کے ساتھ ساتھ جوان ہو رہی تھیں، مجبوریاں اُسے صبر و استقلال کی تلقین کر رہی تھیں مصائب میں گھری ہوئی انسان کا چارہ ہی کیا ہے۔؟

۳

دُکھ کے دن پہاڑ کی طرح گذر رہے تھے، رنج و آلام نے اسکی بڑھتی ہوئی کونپلوں کو سکھا کر کانٹا کر دیا، مصیبتوں کا پُتلا گوپال چودہ برس کا تھا، کسی مالدار کا چشم و چراغ ہوتا تو جوانی کی سُرخیاں چہرے پر جھلکتیں، مگر فاقوں کا پلا ہوا چہرہ مصائب کا مرقع معلوم ہوتا تھا، رنج و آلام کا حامل کمزور جسم خزاں رسیدہ شاخ کی طرح خشک تھا۔ جسکی پتیاں اور تازگی خزاں کی نذر ہوچکی تھیں، ہڈیوں کا ڈھانچہ بدن اس کی بے بسی کی تصویر تھی۔ کیونکہ لاڈ پیار اور ناز و نعم کی گود اسے نصیب نہیں ہوئی، دولت کی ٹھنڈی چھاؤں تلے یہ مرجھایا ہوا پودا پروان نہیں چڑھا ماں باپ کی بے بہا نعمت اسے میسر نہ تھی، وہ مصیبتوں کی گود میں کھیلا تھا، غربت کے فاقوں میں پرورش پائی تھی، مصیبتوں نے اُسے جوان بنا کر کبھی نہ ختم ہونے والی مصیبتوں کی دنیا میں دھکیل دیا، جیون بھر دھکے کھانے کے لئے۔!

جوان ہوکر اس نے محنت مزدوری سے پیٹ بھرنے کی ٹھانی اس نے ایک جگہ دیکھا کہ کسی دھن وان کی عمارت تعمیر ہو رہی تھی "مجھے مزدوری پر لگالو۔! آپ کی بڑی دیا ہوگی" اس نے ایک سے نہایت عاجزی سے کہا۔

"تم مزدوری کیا خاک کروگے" وہ سر سے پاؤں تک اس کا جائزہ لے کر بولا، کیا سر پر پتھر اٹھاؤ گے، اس سیڑھی پر صبح سے شام تک بیسیوں مرتبہ چڑھنا ہوگا، یہ کیونکر برداشت کروگے؟"

"میں سب برداشت کرلوں گا، اس پیٹ کی خاطر جو میرا دم نکال رہا ہے،

"نہیں نہیں، ہمیں ایسے کمزور کی ضرورت نہیں میاں کہیں بھیک مانگو بھیک۔!"

"تب مجھے کوئی بھیک بھی نہیں دیتا" اس نے افسردہ ہوکر کہا اور چلا آیا۔

۴

"چوری کی نیت سے آئے ہو"؟

"نہیں مہاراج! نوکری کی تلاش میں ہوں۔ مجھے روٹی کپڑے پر رکھ لو، میں اس سے زیادہ کچھ اور نہیں چاہتا"

"مگر کام کیا کروگے" سیٹھ نے مسکرا کر کہا۔

"آپ کے ہاں بیسیوں نوکر ہیں، ایک غریب کو فاقوں سے بچالو، ساری عمر آپ کا جشن گاؤنگا! جو خدمت مجھ سے ہوسکے گی کرونگا؟"

"مگر تم جیسے چلتے پھرتے آدمی کا کیا اعتبار؟"

"مہاراج مجھ پر وشواس کیجئے۔ آپ کو کبھی شکایت نہ ہوگی"

"دامودر! دامودر" سیٹھ جی نے ایک نوکر کو آواز دی، دامودر دوڑ کر آیا۔

"اسے رات چوکیداری پر ساتھ رکھنا، باہر کے پھاٹک پر اس سے پہرہ لو، دیکھو کیسا کام کرتا ہے سیا"

سیٹھ جی کے ہاں گوپال کو چوکیداری مل گئی، ناامیدی کے غار میں پڑی ہوئی امید پھر ایک مرتبہ چمک اٹھی، پیٹ بھر کے کھانے کا سامان ہوگیا، ڈوبتے کو، تنکے کا سہارا مل گیا ــ!

اسے چوکیداری کرتے دو ماہ گذر گئے، وہ تمام رات پھاٹک کے آگے پہرہ دیتا ــ! سچ پوچھو تو وہاں سیٹھ جی کا رکھا ہی کیا تھا، خالی چوکیداری تھی ــ!

ایک روز کسی ملازم کی بددیانتی سے سیٹھ جی کی کوٹھی سے دن دہاڑے کچھ معمولی سامان چوری چلا گیا، سیٹھ جی نے تمام ملازمین کو طلب کیا، گوپال جو رات بھر جاگنے کے بعد اونگھ رہا تھا، اسے بھی بلوالیا گیا ــ!

"کیوں تمہیں کچھ چوری کا علم ہے؟" سیٹھ جی بولے ــ!

"مہاراج میں کیا جانوں؟ میری رات کی نوکری ہے ــ!" ہاتھ جوڑ کر بولا،

سیٹھ جی نے ایک نظر دوسرے ملازمین کو دیکھا، جو جی ہی جی میں کھسیار ہے تھے، ان کی مردم شناس نگاہ گوپال کے چہرہ پر آکر رک گئی ــ!

"سچ سچ بتاؤ، مجھے تم پر شبہ ہے" گوپال سر جھکائے خاموش کھڑا تھا ایک بے قصور مجرم کی طرح جو اتنے بڑے جرم کے نام سے جس کا وہ مرتکب نہ تھا، پشیمان ہو رہا تھا ــ!

"بتاتے ہو یا پولیس کو بلاؤں؟"

"پولیس" اس نے کانپ کر کہا،

"مہاراج میں بے قصور ہوں" اس کی جھکی ہوئی نظریں رحم کی درخواست کر رہی تھیں، سیٹھ جی نے اُسے تڑ سے ایک طمانچہ دیا، ہانپتے ہوئے بولے "تمہاری نوکری آج سے ختم، خبردار آئندہ کبھی یہاں مت آنا ورنہ حوالات میں دیدوں گا"

"دیا کرو مہاراج!" روتے ہوئے بولا

"جاتے ہو یا نہیں؟" گرج کر بولے، گوپال آنسو بہاتا ہوا نکل گیا۔

۵

وہ دو روز سے بھوک کی شدت سے تڑپ رہا تھا، جی میں آیا کہ چلو کہیں اور قسمت آزمائی کرے، ایک ناکام کوشش کرتے ہوئے تھوڑی دیر نکلا تھا، سو بدن کانپ رہا تھا، پاؤں ڈگمگا رہے تھے، ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں، وہ گرتا سنبھلتا سڑک پر پہنچا، شام کی تاریکی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی، سڑک پر کہیں کہیں بجلی کے قمقمے مشعل کا کام دے رہے تھے، دفعتاً کانوں میں موٹر کے ہارن کی آواز آئی، وہ گھبرا کر تیز تیز قدم اٹھانے لگا، مگر نقاہت کی شدت سے آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا، وہ لڑکھڑا کر گر پڑا، موٹر اوپر سے دندناتی ہوئی نکل گئی! زندگی کا عقدہ موت نے حل کر دیا۔

سڑک پر خون میں لتھڑی ہوئی لاش پڑی تھی، جس پر کوئی رونے والا نہ تھا، بے کسی کی موت پر کسی کی آنکھ میں آنسو نہ تھے، اس کی پاس دھن نہ تھا اسلئے دنیا میں اس کا کوئی وارث نہ تھا، کسی دھن وان کی لاش ہوتی تو موٹر کا تعاقب ہوتا، پولیس کو فون کئے جاتے، اخباری حلقہ میں ایک سنسناہٹ دوڑ جاتی، اخبارات میں اس کی موت کی خبر جلی حروف میں شائع کیجاتی، کاروبار بند کئے جاتے، بازاروں میں ہڑتال ہوتی مگر اس دنیا میں غریب کا پرسان حال ہی کون ہے؟

محمد امین شرقپوری

لمعاتِ قمر

حضرتِ قمر بدایونی مدظلہ

عشق ہی راز بھی ہے عشق ہی افسانہ بھی　　شمع بھی جلتی ہے اس آگ میں پروانہ بھی
آپ بہلائیں گے دل کو تو بہل جائے گا　　بات مطلب کی سمجھتا ہے یہ دیوانہ بھی
میں نے کب ظلم سہا آپ نے کب ظلم کئے　　ہاں وہ روداد بھی فرضی ہے یہ افسانہ بھی
دل سمجھتا ہے نہ دلدار کو رحم آتا ہے　　مجھ سے بیزار یگانہ بھی ہے بیگانہ بھی
دونوں یکساں ہیں مقدر میں اگر چین نہ ہو　　تیری چھائی ہوئی بستی بھی ہے ویرانہ بھی
سختیِ ہجر کی تکمیل کا وقت پہنچا　　ختم ہے زیست کے ساتھ آج یہ افسانہ بھی
یوں تو وہ مجرمِ الفت ہی سمجھتے ہیں مجھے　　رحم آتا ہے تو کہہ دیتے ہیں دیوانہ بھی
دلِ مجبور کی روداد نہ سننے والے　　رنگ لائیگا کبھی روز یہ افسانہ بھی
کون ہے وہ جسے دنیا میں فراغت ہو نصیب　　اک نہ اک دھن میں ہے فرزانہ بھی دیوانہ بھی
دلِ تاریک کو معمورِ تجلّی کر دے　　تیری ہی یاد کا گھر ہے یہ سیہ خانہ بھی

جان و دل سے ہیں محبت کے خریدار قمر
یعنی قیمت بھی لئے بیٹھے ہیں بیعانہ بھی

مکتوبات لبیب

مرتبہ عرش تیموری

(۳۱)

بارہ دری، کوچہ چیلان دہلی　　　　　　　　۱۲ مارچ سنہ ۱۹۳۹ء
۹½ وقت شب

احمد میاں سلمہ! دعا۔ آج تمہارا تار پہونچا، بہت کوشش کی کہ آج ہی مضمون درست کرکے روانہ کردوں مگر ممکن نہ ہوا۔ اب رات کے ساڑھے نو بجے مضمون سے فارغ ہوا۔ دیر کی وجہ یہ کہ (۱) ایک تو حضرت مولوی صاحب قبلہ کے انتقال کے بعد سے میں بالکل بے کار ہوگیا ہوں (۲) مولوی ہاشمی صاحب نے ایکدم چھ کتابیں ریویو کے لئے دیدی تھیں، ان میں ایک ہفتہ لگ گیا۔ آج صبح کو ان کتابوں سے فارغ ہوکر آرام کا خواہشمند تھا کہ تمہارا تار آگیا اور تمہارا کام بھی ختم کرکے روانہ کررہا ہوں۔

میری رائے میں "خیال آفریں دماغ" کا یہ حصہ اتنا زوردار اور با اثر نہیں جتنا کہ پہلا حصہ ہے، اسکو با اثر بنانا چاہئے اب تم اسے دیکھو، تاکہ محض بچکانی جذبات ہی نہ ہوں، جذبات کے نتائج کچھ معقول باتیں، نصیحتیں یا تجربات ہونے چاہئیں تم اس کو صاف کرکے ایک دوسری نظر ڈالو، خدا سے امید ہے کہ یہ مضمون بھی ویسا ہی پر اثر ہو جائیگا!

لمبے ڈیش تم نے بیحد لگائے ہیں، ذرا احتیاط کرو۔ بچکانے خیالات سے پرہیز کرو، ایسے الفاظ اور واقعات نہ لکھو جس سے لوگوں کو بدگمانی کا موقع ملے، کیونکہ دنیا عجیب مقام ہے —— ہمدرد ندارد، در بیدرد ہزار ہا

"من صنف فقد استہدف"

یعنی جس نے کوئی تصنیف کی وہ تیروں کا نشانہ بن گیا —— یہ بہت پرانی مثل ہے اس سے معلوم ہوا کہ بیدردی ہمیشہ سے چلی آرہی ہے، لہذا اپنے ہاتھ پیر بچا کر لکھو!

اب کل یعنی ۱۳ مارچ کو یہ مضمون تمہارے نام رجسٹری ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی پچاس روپے کا منی آرڈر بھی تمہارے نام کررہا ہوں۔ خدا کرے تم ساتھ صحت و سلامتی یہاں پہونچو۔ تم نے منی آرڈر بذریعہ تار روانہ کرنے کی خواہش کی تھی اور میں بھی آمادہ تھا، مگر میں سوچ رہا ہوں کہ اگر تم بذریعہ تار بھیجی تو تم روانگی کی تیاری شروع کردوگے، ایسی صورت میں شاید یہ رجسٹری تم کو نہ ملے یا اگر ملے تو تم کوئی کام نہ کرسکو اس لئے مناسب یہی ہوا کہ رجسٹری اور منی آرڈر ساتھ ساتھ کروں تاکہ تم حسب مناسب کوئی عمدہ فیصلہ کرسکو۔

اگر ممکن ہو تو اپنی سند ساتھ لیتے آؤ، اور سب سامان بیرنگ پارسل میرے نام کرکے ریلوے رسید بذریعہ رجسٹری بھیجدو۔ میں یہاں چھڑا لوں گا انشاء اللہ۔

زیادہ کیا لکھوں۔ بہرحال اب کوئی سامان اپنا وہاں نہ چھوڑو۔ راستے میں جہاں ٹھہرو وہاں سے ایک کارڈ میرے نام بھیجدو اور اپنی جائے قیام بھی لکھنا۔

بانو بیوی، ودھا میاں، منی میاں اور فیروزی کی طرف سے دعا۔ والسلام

(لبیب)

(۴)

بارہ دری، کوچہ چیلان دہلی ۶ر جولائی سنہ ۱۹۳۹ء

احمد میاں سلمہٗ! دعا، تمہارے دو خط آج ساتھ ساتھ ملے۔ ڈاکیے نے یہ شکایت کی کہ خط کا پتہ ٹھیک نہیں اس لئے تلاش میں دیر لگی۔ وہ یہ کہ (۱) نام صرف حضرت لبیبؔ لکھا گیا اور ڈاکیہ اس نام سے واقف نہ تھا۔ لہذا پورا نام لکھا کرو۔

(۲) پہلے کوچہ چیلان اور اس کے بعد نیچے بارہ دری لکھا گیا ــــ حالانکہ پہلے بارہ دری اور اس کے نیچے کوچہ چیلان لکھنا چاہیئے۔

آئندہ اس کا خیال رکھو ہمیشہ خط پر پتہ ایسا لکھا کرو کہ ڈاکیہ آسانی سے پہونچا سکے۔ اب تمہارے ۱ر جولائی کے خط کا جواب دیتا ہوں۔

(۱) تمہاری تاریخ میں بیاڑیاں ڈلوا کر کتابوں کے صندوق کے ساتھ پارسل کردوں گا۔ انشاء اللہ۔

(۲) سنگل سِیٹ کو ضرور آرام رہیگا اور سامان کی بہی حفاظت رہیگی ایک قفل عمدہ قسم کا خرید لو تاکہ دوسرے لڑکوں کے بے اجازت داخل ہونیکا امکان نہ رہے۔

(۳) باجی جان کو تمہارا خط اور معذرت دکھادی۔

(۴) یکم جولائی کو ایک منی آرڈر اکیانوے ۹۱ روپے کا تمہارے نام بھیجا ہے اور ایک خط بھی ساتھ ہی روانہ کیا ہے رقم کی رسید اور خط کے جواب کا سخت انتظار ہے۔

(۵) کھانے کی آفت البتہ مصیبت کی چیز ہے، جب تمہارا کمرہ الگ ہوگیا ہے تو امید ہے کہ جو کھانے پینے کی چیزیں یہاں سے تمہیں بھیجی جائیں وہ تمہارے کھانے میں آسکیں گی۔ خیر اس کا انتظام کیا جائیگا۔

تم دونوں دوائیں صندوق میں سے نکالو اور حسب طریق ذیل روزانہ صبح و شام کھانا کھانے کے بعد دوا کا استعمال جاری رکھو ایک گولی پانی کے گھونٹ سے نگل جاؤ اور دو چائے کے چمچے دوا گلاس میں ڈال کر اوپر سے پی جاؤ۔ اپنی صحت کی نگرانی کرو، تمہارا خط دولہا میاں کو دیدیا، اس کام کے واسطے روشن اختر کلکتہ چلے گئے۔

۴ر جولائی کے خط کا جواب:۔

پرنسپل مجبور کر رہے ہیں تو بالفعل چپ ہو جاؤ، ان کے خلاف کوئی جواب نہ دو اور ان پر محبت کا اثر ڈالو۔ جب ورشوا ... یونیورسٹی کا کورس پروٹس میں تسلیم کرلی جائے گی، اس وقت سوچیں گے کہ دہلی میں پڑھو گے یا لکھنؤ میں۔ ان مسائل پر غور کرنے کو بہت مدت باقی ہے۔

چاہے تمہارے دل میں آئندہ وہاں رہنے کا ارادہ نہ ہو لیکن ایف اے کی سند حاصل کرنے تک وہاں سے جانے کا خیال نہ ظاہر کرو۔

تم اپنے پورے واقعات تفصیل سے لکھو۔ آئندہ تعلیم اور ڈپٹی کمشنر کے پاس کوشش کے مسائل پر آئندہ خطوط میں گفتگو ہوگی انشاء اللہ۔

دولہا میاں اور بانو بیوی کی طرف سے دعا، فہمی میاں اور فیروزی کی طرف سے سلام۔

(لبیبؔ)

(۵)

بارہ دری، کوچہ چیلان دہلی ۱۵ر جولائی سنہ ۱۹۳۹ء

احمد میاں سلمہٗ! دعا، خط پہونچا۔ بحمداللہ میں خیریت سے ہوں پرسوں صدیق میاں حیدرآباد دکن سے دہلی آئے

ہوٹل میں ٹھہرے، ایک وقت کی دعوت ہمارے پاس بھی ہوئی تھیں بہت یاد کرتے رہے۔ شاید امرا سنگھ کہ وہ تم کو ساتھ لے کر دہلی کی سیر کا ارادہ رکھتے تھے۔ شاید وہ یہ گمان کرتے ہوں گے کہ تم دہلی کے تمام مشہور مقامات دیکھ چکے ہو۔ خیر میں تو ہاں ہوں کر کے چپ ہو گیا۔

تم بالفعل تو الیف۔ اے کا امتحان دے لو، اس کے بعد دیکھا جائیگا، جہاں تمہاری مرضی ہو وہاں پڑھنا، میں ہر طرح رضامند ہوں۔ بی۔ اے جہاں سے چاہو کرو میں ایک ماہ بعد تمہارے معاملے میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سے بھی تصفیہ کروں گا! ور فروانی صاحب المخاطب بہ صدریار جنگ سے علی گڑھ کر خود مشورہ کر لوں گا۔ اس کی اطلاع تم کو دوں گا انشاء اللہ ۔ اراگست سے انشاء اللہ میرے خاموش روزے شروع ہوں گے اور ان کے ختم ہونے کے بعد مجھے سوائے تمہارے کام کے اور کوئی کام نہیں۔ اب تک میرے دل میں یہی ہمت ہے کہ خدا تم کو یورپ بھیج دے گا، اطمینان سے کام کرو اور دل کو خوش رکھو۔

اردو کی پروفیسری کا حال معلوم ہوا، خیر خدا کی مرضی، ٹیگور کے انتقال کے چرچے سے افسوس ہوا، بہت بڑا شخص ہے مگر غم اس کا ہے کہ فقیری تک اتنے بڑے دعویدار کو ہی خدا پر بھروسہ نہیں اور محض انسانی وہم و گمان پر اپنی موت کا یقین رکھتا ہے!

اشد ضروری:-

دوا جاری کی یا نہیں فوراً اطلاع دو ۱۸ رجولائی کو کتابوں کا صندوق مال گاڑی کے ذریعے سے تم کو روانہ ہو گا۔ اسی میں تمہاری تاریخ اور دوری کا آرسن پہونچے گا۔ اور اسی کے ساتھ کچھ چرندم خرندم بھی۔

(لبیب)

(۶)

بارہ دری کوچہ چیلان دہلی ۲۴ رجولائی ۱۹۴۱ء

احمد میاں (سلمہ)! دعا، تمہارا خط بے تاریخ وصول ہوا، ڈاک خانہ کی مہر سے معلوم ہوا کہ وہاں کا ۲۰ رجولائی کا چلا ہوا ہے جو یہاں ۲۳ رجولائی کو پہنچا۔

تمہاری تحریر کے مطابق جو اس خط میں حسب ضرورت تفصیل سے پائی جاتی ہے، اس ماہ یعنی غالباً ایک ہفتے کے اندر تم کو حسب تفصیل ذیل رقم بھیج دی جائے گی انشاء اللہ تعالیٰ۔ بابت بقایا۔ بابت فیس ماہ اگست جیب خرچ جملہ

سات روپے ۲۷ روپے ۱۰ روپے (چوالیس روپے)

مولانا روم کا فلسفہ "انسان کامل" خوب عنوان ہے، مگر تمہارا مقصد ابھی توضیح طلب ہے:۔

یعنی مولانا روم انسان کامل بننے کی تعلیم دیتے ہیں ——— یا مولانا روم انسان کامل کی ذات و صفات کی تشریح کرتے ہیں اگر پہلی صورت ہے تو ماننا پڑے گا کہ مولانائے روم ایک امر محال کی تعلیم دیتے ہیں اور اگر دوسری صورت ہے تو یہ بتانا پڑیگا کہ مولانا روم نے انسان کامل کی تعریف کیا قرار دی ہے اور پھر اس کی کیا تشریح کی ہے۔

خیر آج ۲۴ رجولائی ہے اور غالباً اس خط کے پہونچنے سے پہلے تم لیکچر دے چکو گے۔ میری دعا ہے تمہارا لیکچر اچھا رہے اور تم دنیا اور دین میں کامیاب رہو۔

عـ۱ تم نے اب بھی نہ لکھا کہ دوا اور گولیاں تم نے شروع کیں یا نہیں۔

عـ۲ تم نے میرے خطوط کا تفصیلی جواب نہیں دیا، شاید مصروفیت کی وجہ سے ہوگا۔

عـ۳ ایک رجسٹری خط تم کو روانہ کیا ہے جس میں کتابوں کا پارسل روانہ کر کے رسید ملفوف کی ہے۔ اس کی تم نے کیا کارروائی کی۔

عـ۴ ایک پوسٹ کارڈ روانہ کیا جس میں میں نے تمہاری علالت کا اندیشہ کیا تھا اور اب بھی باوجودیکہ تمہارا خط آ گیا ہے، مجھے تمہاری

علالت کا اندیشہ ہے۔

(۵) بانو بیوی بہت رنجیدہ ہیں کہ تم نے ان کے خط کا جواب نہیں دیا۔

میں انشاء اللہ ۱ر اگست سے روزے شروع کروں گا اور اگر زندگی ہے تو اس کام سے فارغ ہونے کے بعد دہلی سے باہر نکلوں گا۔ حسبی اللہ نعم الوکیل۔

بانو بیوی، فہمی بیاں، دولھا میاں، فیروزی اور سب کی طرف سے سلام و دعا۔

لبیب

بارہ دری کوچہ چیلان دہلی

۲۸ر جولائی ۱۹۳۹ء

دہلی

احمد میاں سلمہٗ! بعد دعا معلوم ہو کہ میرے کئی خطوں کا جواب تم نے نہیں دیا اور میں تمہارے ہر خط کا جواب دے چکا۔
اس درمیان میں ایک رجسٹری خط تم کو بھیجا گیا جس میں گڈس پارسل کی رسید بھیجی، معلوم نہیں کہ وہ پارسل (کتابوں کا صندوق) تم نے بول پور اسٹیشن سے وصول کیا یا نہیں۔ ایک کارڈ تمہیں لکھا تھا کہ مجھے تمہارے خط نہ لکھنے سے تمہاری علالت کا شبہ ہوا اور دو دن خط کا انتظار کرنے کے بعد کارڈ لکھ دیا تھا

ان دونوں کا کوئی جواب ابھی تک نہ ملا، پارسل کی وصولی کی اطلاع کا سخت انتظار ہے کہ اس میں ایک روپے کی دال نجی، شارح اور دری کا آسن بھی رکھ دیا تھا اور پارسل کا محصول یہیں ادا کر دیا تھا۔

تم نے دوا شروع کرنے کی کوئی اطلاع نہ دی۔ محمد مرزا اور میاں حیدر اکثر تم کو پوچھتے ہیں اور محمد مرزا تمہارے متعلق اچھی امیدیں رکھتے ہیں۔

میاں حیدر نے تم کو سلام کہا ہے، شاید بہادر نے کوئی خط بھی لکھا ہے۔

مولانا روم کا فلسفہ "مرد کامل" کا مضمون شاید تم نے پڑھ کر سنا دیا ہو گا۔ بہت جلد اپنی صحت اور میرے سوالات کا جواب ادا کرو۔ آجکل مدن بیمار ہو کر یہاں آئی ہوئی ہیں اور علاج ہو رہا ہے۔

فیروزی، فہمی کا آداب، دولھا میاں اور بانو بیوی کی طرف سے دعا۔ والسلام۔

لبیب

ثنا

انسان و خداوند کے مابین ہے شاعر
اک جنسِ درخشندہ و پایندہ و بیدار
ملتی ہے ازل سے جسے احساس کی دولت
فطرت جسے کرتی ہے عطا جذبۂ خوددار
جبریل کی پرواز، پیمبر کی رسائی
قرآں کا تقدس، دلِ فرعون کا انکار

میری فطرت

مصائب سے الجھکر مسکرانا میری فطرت ہے
مجھے ناکامیوں پر اشک بہانا نہیں آتا
نگاہیں جس کی جم جاتی ہیں مستقبل کے چہرے پر
اسے ماضی کی بے رحمی کو دہرانا نہیں آتا

احسان دانش

[illegible]

(گذشتہ سے پیوستہ)

جلیل:۔ ہاں یہ وقت ہے تو خوشی کا اور خوش ہی رہنا چاہیئے۔ لیکن گزشتہ واقعات میں کچھ اس درجہ لچسپیاں ہیں کہ جب کبھی وہ یاد آجاتے ہیں تو دل ودماغ ساکت رہ جاتے ہیں۔ کہ فلک کی ستم ظریفی اور ناداری انسان کو کیسا کچھ کرنے پر مجبور کردیتی ہے۔ آج اپنے میں حیرت ہوتی ہے کہ دنیا کی سٹیج پر کیا یہ ڈرامہ ہم ہی نے کھیلا تھا اور یہ پارٹ، ہم ہی سے لیا جارہا تھا۔

خورشید:۔ ہاں یار اپنی سرگزشت تو سناؤ۔ تم ایک روز ملے تھے۔ تم پہلی سٹیج میں قیس کے جانشین معلوم ہوتے تھے تم نے آہستہ سے میرے کان میں کہا تھا کہ "میں آجکل مزدوری کر رہا ہوں"۔

جلیل۔ ہاں ہاں مزدوری اُن حالات میں محض زندہ رہنے کے لئے ایک اچھا سہارا تھی بشرطیکہ ہم پڑھے لکھوں کے تہذیب جدید میں ڈھلے ہوئے قولے اس کے متحمل بھی ہو سکیں۔ پہلے دن ہم گئے مالک کا حکم یہ تھا کہ چھت کو کدال سے کھودو۔ اور ٹوکریاں بھر بھر کے سامنے چھت میں جو گڑھا کھودا گیا ہے اس میں ڈالتے جاؤ۔ پہلے تو ہم نے خوب شوق سے کدال چلائی۔ لیکن آدھ گھنٹہ کے بعد معلوم ہوا کہ دم پھولنا اور بازو اکڑنا شروع ہو گئے ہیں اور ہم جو پورے ایک دن سے فاقہ سے ہیں یہ کام ہمارے بس کا نہیں۔ دوسرے مزدور کھدائی کرتے رہے اور ہم ٹوکریاں اٹھا اٹھا کر اس گڑھے میں پھینکتے رہے۔ بارہ بجے سب مزدور۔ کدال اور ٹوکریاں پھینک ہاتھ منہ دھو کھانے پر ڈٹ گئے۔ اور ہم الگ الگ ٹاٹ پر پڑ کر ان کے نوالے گننے لگے۔ کسی سے کیا کہتے۔ ۔ کہ بھیا ہمیں بھی کھلاؤ ہم کل سے بھوکے ہیں اور آج کی مزدوری نے پسلیاں بھی دکھا دی ہیں۔ مزدور کھانا کھانے کے بعد خوش گپیاں کرنے لگے۔ ایک نے ہم سے کہا کہ تم کھانا تو کھا آئے ہو گے۔ تو بیڑی تو پی لو۔ ہم اٹھے پیٹ بھر کر پانی پیا۔ پھر بیڑی سلگا فضاؤں میں دھواں اڑانے لگے۔ کوئی سمجھے کہ ہم سے بڑھ کر کوئی شاد نہیں۔ اسکے بعد مزدور پھر کام پر جا لگے۔ ایک نے ٹاٹ کو تہ کر ہمارے سر پر بھی رکھدیا کہ کام شروع کرو۔ دن ختم ہو گیا لیکن ایسا معلوم ہوا کہ ہلکا سا بخار ہو گیا ہے۔ شام کو ہاتھ منہ دھو مالک سے مزدوری لے شہر میں آگئے آتے ہی ایک پیسہ کی گنڈیریاں اور ایک پیسہ کی تیل کی مٹھائی لی اور وہیں چورستے میں کھڑے کھڑے کھا گئے۔ وہیں کے ایک آشنا مل گئے۔ خیر سلا پوچھی۔ کہنے لگے کچھ خرید وفروخت کے لئے تشریف لائے ہونگے آپ۔ ہم نے ایسے ہی۔ ہوں۔ ہاں کر دی کہنے لگے چلیئے غریب خانہ پر وہیں قیام فرمایئے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کر انہیں ٹال دیا۔ دوسرے روز کے بعد جب تیسرے دن مزدوری پر گئے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جسم کا بند بند درد کر رہا ہے۔ اور جوڑ جوڑ سے مارے درد کے ٹیس اٹھ رہی ہے جیسے کسی نے مار مار کر کچومر نکال دیا ہو۔ چلنے پھرنے تک کی ہمت نہ تھی۔ اُدھر کام اتنا حوصلہ شکن کہ فرہاد کی کوہکنی کا قصہ یاد آرہا تھا۔ اور ہمت ٹوٹ ٹوٹ جاتی ہے۔ اُدھر پیٹ کی آگ اور افلاس کی بھیانک شکل۔ دونوں قوتوں میں جنگ ہوئی۔ جیت افلاس کی شدت کی ہوئی۔ تیسرے دن منٹ منٹ سیکنڈ سیکنڈ گن گن کے جو ہم نے کاٹا ہے وہ ہم ہی جانتے ہیں۔ انگلیاں ٹوکریوں کے کناروں نے چھید ڈالی تھیں۔ فگار ہی فگار اور زخم ہی زخم تھے تین دن کی کل کمائی چھ آنہ یومیہ کے حساب سے ایک روپیہ دو آنے ہوئی یہ قلیل رقم مسافرت میں ہوتی ہی کیا ہے۔ یوں سمجھو کہ ڈوبتے کو تنکا کا سہارا تھی یہ رقم بہت کھینچ کھانچ کے اور بعض دن فاقے کرنے کے باوجود ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ نکال سکی۔ ایک روز پھر جو آنتیں قل ھو اللہ

پڑنے لگیں اور پیٹ میں مروڑ اٹھنے لگے تو پھر اسی عمارت پر کام کرنے کے لئے بادل ناخواستہ آمادہ ہو گئے۔ ہمت کا قدم پیچھے ہٹ رہا تھا۔ بھوک اور غیرت آگے دھکیل رہی تھی۔ اسی کشمکش میں عمارت تک جا پہنچے۔ مستریوں سے معلوم ہوا کہ اب اور مزدور کی انہیں ضرورت نہیں۔ مزید معلومات کے لئے مالک سے ملنا چاہئے۔ انکار کا لفظ سنکے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ گو شکم پُری کے لئے ایک راہ تھی۔ بدنصیبی اسے بھی بند کرنے کی فکر میں ہے۔ مالک کے پاس گئے۔ اجازت مل گئی کہ کام کرو۔ ہم کوٹ ووٹ اتار۔ لنگوٹ باندھ مستریوں کے پاس آن ڈٹے کہ کام دو۔ کہنے لگے کہ پیچھے جاؤ۔ ½ فرلانگ کے فاصلہ پر اینٹیں پڑی ہیں وہ اٹھا اٹھا کے یہاں لاتے جاؤ۔ ہم گئے پہلے سات اینٹیں اٹھا کے لائے اور ہمارے ساتھی گیارہ۔ دو ایک پھیرے کئے تھے کہ قدر عافیت معلوم ہو گئی۔ ساتھیوں نے ہماری شکایت کی۔ مالک بھی وہیں کھڑے تھے۔ کہنے لگے کہ یہ کیا انصاف ہے کہ ہم تو گیارہ اینٹیں اٹھائیں۔ اور چھ آنے مزدوری لیں۔ اور یہ سات اٹھائیں اور مزدوری ہمارے برابر پائیں اس میں کونسے لعل ٹکے ہوئے ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ وہ ٹھیک کہتے تھے۔ کیونکہ جب میں انکے برابر مزدوری لیتا ہوں تو کام بھی مقابلہ پر برابر کرنا چاہئے۔ اب کے جو ہم گئے تو ستاؤ کھا کے نو اٹھا لیں۔ ½ فرلانگ کا فاصلہ ہم جیسے دھان پان انسان راستے ہی میں مارے بوجھ کے دبنے لگے کانپنے لگے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گردن کا منکا ٹوٹ جائیگا۔ ہزار دل کو قابو میں لاتے تھے اور پائے ثبات کو لرزنے نہ دیتے تھے۔ لیکن عالم یہ تھا کہ برابر تھرا رہے تھے۔ بڑی مشکل سے منزل مقصود تک پہنچے۔ نو ایک پھیرے کر تو لئے لیکن جن مصیبت کا سامنا تھا دل ہی دل میں الاماں الاماں پکارنے لگے۔ خیال کیا کہ بنا بنایا کہیں ولیا نہ بن جائے۔ منکا ونکا ٹوٹ گیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ پردیس میں سوائے ذات خدا کے اور کوئی ناصر نہیں ایک نئی قیامت سر پہ ٹوٹ پڑیگی۔ اور نا امید اور ناکامی کی جھلک جو تاداری میں بھی سنبھالے چلی آرہی تھی خواب پریشاں بن کر رہ گئی۔ ہمت اور جانفشانی دکھانے کے لئے امکان سے بڑھ کر کرنے کا عزم کیا۔ لیکن جب اپنے آپ کو آپ کو بالکل بے بس پایا تو وہیں پیٹ پر ہاتھ رکھ کر۔ گویا ہمارے پیٹ میں شدت کا درد ہو رہا ہے۔ اوپر مالک کے پاس آئے اور اپنی تکلیف کا اظہار کرتے چھٹی چاہی۔ روانگی پر ایک اکنی ملی۔ ایک در بند سو در کھلے۔ امید کی جھلکیاں۔ الاماں۔ اکنی جیب میں ڈال چلے آئے۔

خورشید۔ اخا۔ خا۔ خا۔ خا۔ غربت بھی کیا کیا کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔؟ واہ ری سندر نار۔ تیرے چونچلے۔

جلیل۔ صرف ایک ہی واقعہ نہیں۔ تم پورے تین مہینے کے بعد ملے ہو۔ اس لئے اس مدت کی ساری سرگزشت سُن لو۔ کچھ نہ کچھ تو سن لو۔ تم جانتے ہو کہ ہمارا خط تو اچھا ہے ہی۔ نیم کاتب کہہ لو۔ ایک روز پھر فاقے کا دن تھا۔ ہمت کر کے چل کھڑے ہوئے۔ دوسرے دن ایک حکیم صاحب کا بورڈ لکھنے کو ملا۔ حکیم صاحب مذکور کا بورڈ لکھنا تھا اور پھر اُسے کٹوا کر دیوار پر چسپاں بھی لینا تھا۔ دن کو تو لوگ خواہی نخواہی اپنی دیواروں کو سیاہ کروانے پر آمادہ نہ ہوئے۔ ہم ساری ساری رات گھومتے چوروں سے دیواریں سیاہ کرتے۔ نیند کی شدت چکراتی تو بہت لیکن صبح کو نقدی ملنے کی امید ہمارے حواس پر آفتاب روشن کر دیتی اور ہم بخوشی رات سے دن کر دیتے۔ اس کے بعد خیال ہوا کہ کام کی تلاش بھی چاہئے اور بورڈ نویسی بھی۔ گذر اوقات کے لئے بظاہر اچھا مشغلہ ہاتھ لگا۔ طبیعت میں کچھ سکون اور اطمینان سا تھا۔ ہم ہر روز علی الصبح برش اور رنگ کا ڈبہ لئے ہر طرف گھومتے اور کھٹ بنوں کی طرح دل کی زبان سے آواز لگاتے کہ بورڈ لکھوا لو ہم سے بورڈ۔ بورڈ۔ ایک صاحب نے بورڈ لکھوایا اجرت آٹھ آنے طے پائی۔ زمین سبز ہوئی اور ہم اپنا تمام جام سنبھال تک کھڑے ہوتے ہوتے۔ اور حرف سفید۔ بورڈ جب تیار کرکے دیا تو وہ ان کے ناپسند ہوا۔ وہ کام کو سمجھنے والے معلوم ہوتے تھے تار گئے کہ اپنی جنٹلمینی میں بورڈ نویسی کا دنیا سے مذاق کرتے پھر رہے ہیں۔ اور یقیناً اس فن میں ہمارا درجہ ہو۔ ۔ ۔ ۔ میں ہے۔

پہلے تو بغیر کام د[illegible] طے کرچکے تھے اسلئے وہ انکی ادائی پر مجبور رہے۔ دل میں حرج تو بہت ہوئے لیکن بغیر ادائگی کوئی صورت نہ دیکھ کر جیچے سے پورے آٹھ آنے ہمارے ہاتھ میں تھما دئے۔ نقدی کی نعمت جیب میں تھی۔ راستے میں ہم اپنے موجودہ کاروبار پر دل ہی دل ہیں بہت ہنسے۔ قریب تھا کہ ہم شاہراہ عام پر قہقہہ لگا دیتے۔ رہ رہ کے خیال ہو رہا تھا کہ قدرت کا دست کرم عطائے نعمت میں کیسی دلچسپ راہیں اختیار کر رہا ہے۔

خورشید :۔ عزم کے استقلال سے تقدیر کی قوتوں کو شکست دی جا سکتی ہے۔

جلیل :۔ ہاں اگر شکست نہیں دی جا سکتی۔ تدبیر سے تقدیر کو سدھارا ضرور جا سکتا ہے۔ سنو ایک اور دلچسپ واقعہ ایک روز جیب میں صرف دو آنے تھے۔ کھانا بھی کھانا تھا اور حجامت کا بھی خیال تھا۔ بارہ ایک کا عمل تھا باغ میں ارادہ کیا کہ سایہ دار جگہ بیٹھ کر کھانا کھائیں گے۔ ہمارے پاس ایک مقامی ادبی رنگین ماہنامہ تھا۔ ایڈیٹر حضرات اگر کسی مد اور شعبے میں کام نہ دیں۔ لیکن ایک عدد تازہ بتازہ رسالہ ضرور مفت عنایت فرما دیتے تھے۔ ایک تو خیر حجام صاحب تشریف لائے "ولداده و دلدادہ شیرائے ادب" کہنے لگے رسالہ دیکھ سکتا ہوں۔ ہم نے کیا شوق ہے۔ وہ شاید اردو میں کچھ شد بد رکھتے تھے۔ کہنے لگے حجامت بنے گی؟ ہم نے کہا بنے گی تو سہی لیکن لو گے کیا؟ کہنے لگے بشیوا ہم نے کہا نہیں دو پیسے رسالہ پڑھنے لگے۔ پھر آپکا کیا خیال ہوا آمادہ ہو گئے۔ کہنے لگے بنوا لیجئے۔ رسالہ کے سرورق اور اوس کی اندرونی لطافتوں میں گم ہو رہے تھے۔ ڈاڑھی پر برش لگا رہے تھے کہنے لگے رسالہ کی قیمت ۳ رہے۔ ہم نے کہا ہاں ۳ رہے۔ جواب ملا اگر ہمارے پاس پیسے ہوتے تو ہم ضرور خرید لیتے۔ ہمیں رسالے اور کتابیں پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ ہم نے کہا۔ تو اسکے معنی ہوئے کہ تم اس مایۂ ناز ادبی صحیفے سے مستفید ہونا چاہتے ہو۔ کہنے لگے جی ہاں۔ کیوں نہیں۔ ہم نے کہا۔ اچھا یار دل بھی تو توڑا نہیں جاتا۔ تم بھی کیا یاد کرو گے۔ پوری حجامت بنا دو (داڑھی اور بال) اور جاؤ رسالہ تم لے جاؤ دل لگا کے پڑھو لیکن احتیاط لازم ہے۔ شکریہ ادا ہوا۔ شیو بھی بنا فیشن ایبل بال بھی کٹے۔ ہم اپنی ایک عدد دونی کی خیر مناکر اپنی ملائم داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے چلے آئے۔

خورشید :۔ اخا۔ خا۔ خا۔ خا۔

دیکھو خورشید میں اگر ان ہمت شکن مصائب کے سامنے ہتھیار ڈال دیتا۔ اور مردانہ وار مقابلہ کرتا تو آج مجھے فوز مرامی کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوتا آج میں ان سنگلاخ چٹانوں کے بعد نہایت شاد ہوں۔ قدرت کا قانون ان مٹ اور اٹل ہے وہ کبھی ناانصافی نہیں کرتی۔ اُس صادق حاکم کے ہاں ہر وقت کی داد اور ہر آزمائش کا انجام ستارۂ شادمانی کا طلوع ہے۔ امکانی کوششوں اور انتہائی قوتوں کے ساتھ امید اور آرزو کا بیج بو دو پھر اس کے ثمر ہونے کی قادر مطلق کی سچی سرکار میں التجا کرو۔ جس کے کچھ بویا ہی نہیں اُس کی بار آوری کی اُمید خام ہے۔ ساحل عافیت کی تمنا میں دنیا کے حوادث اور طوفانوں سے ٹکراؤ۔ ایک دن قدرت خود بخود مجبور ہوگی کہ ساحل اور منزل تک تمہاری رسائی کرے۔

نسیم چغتائی

سگریٹ کیس

(جہان نگار زوردی کا شاہکار)

(گذشتہ سے پیوستہ)

ایکٹ اول منظر تیسرا

نواب شوکت [لفافہ کو چھوتے ہوئے] غالباً مجھے بھی اس نام پر حق ہے۔ اپنا سمجھ کر کھول لیا۔

صفدر۔ [ذرا ترش ہو کر] ابا جان! بے شک، آپکے میرے ناموں میں مجنیس ہے… لیکن… [خط پڑھتا اور پڑھتا ہے] جائزہ!

نواب شوکت [گھورتے ہوئے] تم اس آسانی سے بچکر نہیں نکل سکتے۔

صفدر۔ ابا جان! کیا آپ پہلے ہی کافی سزا نہیں دے چکے؟

بیگم شوکت اے ہے، ٹھیک تو ہے، ـــــ لڑکے کو ناشتہ تو کر لینے دیجئے

نواب شوکت۔ اگر مجھ سا رکا معزز باپ تمہارا نہ ہوتا تو تم جانتے ہو اسوقت تم کہاں ہوتے؟ یہ سب محض بخت و اتفاق ہے۔ فرض کرو تم کسی غریب آدمی یا کسی معمولی منشی کے بیٹے ہوتے اور بنک میں پورا روپیہ جمع نہ ہونے کے باوجود تم دیدہ و دانستہ فرضی چیک پر کسی سے روپیہ وصول کر لیتے تو تمہاری ساری زندگی تباہ و برباد ہوجاتی۔ اگر تمہارے مزاج کی افتاد اور عادات و اطوار یہ ہی رہے تو خدا جانے آئندہ تمہارا کیا حشر ہو۔! ـــــ میں نے کبھی ایسی حرکت نہیں کی۔ ـــــ

صفدر۔ وجہ یہ ہے کہ آپ کے پاس ہمیشہ کافی سے زیادہ روپیہ رہا۔ ہاں اگر آپکے پاس بھی کافی روپیہ نہ ہوتا تو… البتہ……

نواب شوکت برعکس اسکے، جو رعایتیں اور آسائشیں تمہیں حاصل ہیں وہ مجھے تو نصیب بھی نہ تھیں۔ ابا جان مجھے قدرے قلیل جیب خرچ دیتے تھے۔

صفدر۔ ابا جان! آپکو کیا ملتا تھا۔

نواب شوکت۔ یہ کوئی اہم سوال نہیں! سوال تو یہ ہے کہ تم نے اپنے ... ے فعل کے بدنتائج پر بھی غور کیا یا نہیں

صفدر۔ نتائج پر غور و در تو میں جانتا نہیں، البتہ اگر آپ اسکو برا سمجھتے ہیں تو میں سخت نادم و شرمندہ ہوں! کیا میں نے پہلے ہی عرض نہیں کیا، میں ایسا کبھی نہ کرتا اگر میرا ہاتھ تنگ نہ ہوتا!

نواب شوکت۔ اچھا تو…… اُن چالیس اشرفیوں میں سے تمہارے پاس کتنی باقی ہیں۔؟

صفدر۔ [کسی قدر سوچکر] کسے خبر… کچھ زیادہ نہیں۔

نواب شوکت۔ تاہم، معلوم تو ہو؟

صفدر۔ (منہ بنا کر) کچھ بھی نہیں

نواب شوکت۔ کیا ـــــ؟

صفدر۔ اُف، اللہ!… [سر کو ہاتھوں سے پکڑتے ہوئے] سر میں سخت درد ہو رہا ہے۔

بیگم شوکت۔ درد سر میرے بچے! ذرا سا ناشتہ تو کر لو۔

صفدر۔ [لمبا سانس لیتے ہوئے] بہت ہی سخت!- - - - - اوہ!!

بیگم شوکت۔ میری تو جان پر بن رہی ہے، آؤ بیٹیا آؤ امیر
ساآؤ ما میں ابھی ایسی دوا دوں گی کہ وسد درد سب کافور ہو جائیگا
[وہ دونوں کمرے سے چلے جاتے ہیں، شوکت
آتشدان کے پاس جاتا ہے اور خط کو پرزے پرزے
کرکے ڈال دیتا ہے۔ یکایک شاہد کمرے میں داخل
ہوتا ہے اور اسے دیکھ کر دبے پاؤں واپس جانا چاہتا ہے]
نواب شوکت۔ کیا ہے؟ کیا چاہتے ہو؟
شاہد۔ سرکار، میں چھوٹے سرکار کو ڈھونڈ رہا تھا۔
نواب شوکت۔ ہوں، سرکار کیا کام ہے؟
شاہد۔ [پس و پیش کرتے ہوئے] سرکار...... میں
سمجھا تھا...... کہ یہاں ہونگے!
نواب شوکت [مشکوک انداز میں] ہونھ ——
اچھا! لیکن...... تم انہیں کیوں تلاش کر رہے ہو؟
شاہد۔ (بے جھجکے) ایک خاتون جنکا نام......
نہ جانے کیا ہے! کہتی ہیں نواب صاحب سے صرف
ایک منٹ ملاقات کرنا چاہتی ہوں ——
نواب شوکت۔ ایک خاتون! صبح سویرے!
کیسی خاتون ہے؟
شاہد۔ [سیدھے سادے لہجے میں] کچھ کہہ نہیں سکتا!
کوئی بڑھیا خاتون تو نہیں...... ممکن ہے کچھ خیرات
مانگتی ہو،...... میرا خیال ہے...... شاید
یتیم خانہ کی کارکن یا...... راہبہ ہوگی۔
نواب شوکت۔ اس کا لباس ویسا ہی ہے؟
شاہد۔ نہیں سرکار! وہ بالکل سادہ کپڑے پہنے
ہوئے ہے۔
نواب شوکت۔ کیا کچھ ملاقات کی بھی غرض
ظاہر کی۔؟
شاہد۔ نہیں سرکار
نواب شوکت۔ آخر پوچھا بھی تھا کہ کیوں ملنا
چاہتی ہے؟
شاہد۔ جی پوچھا تو تھا لیکن........

نواب شوکت۔ خیر، وہ ہے کہاں؟
شاہد۔ ہال میں! سرکار
نواب شوکت۔ ہال میں! اس کے چور نہ ہونے کا
اطمینان بھی کر لیا؟ ہماری نسبت کوئی برا خیال، یا
سازش تو نہیں۔؟
شاہد نہیں سرکار! میرے تو حاشیہ خیال میں بھی ایسے
گہرے اندیشے نہیں۔
نواب شوکت اچھا، تو اسے بلا لاؤ، میں ہی ملاقات
کرکے اندازہ کروں۔
[شاہد۔ خاص آزردہ انداز سے جاتا ہے]
فوراً ہی ایک زرد رو نوعمر خاتون کو لیکر آتا ہے جو سیاہ چشم،
خوبصورت، وضعدار کالے مگر کسی قدر میلے لباس میں
ملبوس ہے اسکی سیاہ و سفید چھت کبرے ہیٹ پر گل بنفشہ
کا طرہ بے ڈھنگے پن سے لگا ہوا اور مہین جالی کی سیاہ
چتیوں والی نقاب منہ پر ڈالے ہوئے، اس پر گھبراہٹ
طاری ہے ہرچند مصنوعی متانت ظاہر کر رہی ہے۔ [شاہد اسے
چھوڑ کر واپس چلا جاتا ہے]
اجنبی خاتون۔ اوہ! —— لیکن...... معاف کیجئے
...... کچھ غلطی ہوئی! —— میں —— [واپس
ہونے کے لئے تیزی سے مڑتی ہے۔]
نواب شوکت۔ خاتون! آپ کس سے ملاقات کرنا
چاہتی ہیں؟
اجنبی خاتون [ذرا مڑ کر دیکھتے ہوئے] میں......
نواب صاحب سے ملنا چاہتی ہوں
نواب شوکت۔ خاتون، میں ہی نواب ہوں ——
فرمائیے میرے لائق کیا خدمت ہے۔؟
اجنبی خاتون اوہ! میں...... میں نہیں جانتی [شرم و
حیا سے آنکھیں نیچے جھک جاتی ہیں۔ نواب شوکت اسے
بغور سر سے لیکر پیر تک دیکھتے ہوئے اپنے ہونٹوں کو چباتا
ہے]
نواب شوکت۔ غالباً آپ میرے بیٹے صفدر سے ملاقات

کرنا چاہتی ہیں ؟

اجنبی خاتون [جلدی سے] ہاں، . . . جی ہاں ! بیشک، نواب صفدر سے

نواب شوکت ۔ کیا میں یہ معلوم کرنے کی عزت حاصل کرسکتا ہوں کہ میری مخاطب کون ہیں ؟ [وقفہ] جناب کا اسم گرامی

اجنبی خاتون [شکایت اور مصیبت کے آثار اس کے چہرہ پر نمودار ہوجاتے ہیں] میرا نام ــــ نام ــــ اوہ اس سے کیا کام۔ میں جگ ہنسائی نہیں چاہتی ؛ میں تو صرف ایک منٹ کے لئے نواب صفدر صاحب سے ملاقات کرنا چاہتی ہوں۔

[دلیری سے] دراصل مجھے اُنہی سے ملنا ہے۔

نواب شوکت [بےچینی و اضطراب کو قابو میں رکھتے ہوئے] میرے بیٹے کی طبیعت ناساز ہے۔ اگر آپ مناسب جانیں تو میں آپ کی فرمائش پر غور کرسکوں گا ! کیا آپ مہربانی سے ارشاد . . . . . . ؟

اجنبی خاتون ۔ اوہ . . . . لیکن میں اُن سے مل کر ہی جاؤں گی ــــ میں خاص طور پر ایک غرض سے آئی ہوں ــــ

[بےاختیار رونے لگتی ہے] میں جگ ہنسائی نہیں چاہتی، لیکن اصل واقعہ یہ ہے، ــــ کل رات آپ کے صاحبزادے . . . . اڑا لے گئے . . . . . . میرا . . . . . بے . . . . . [ہچکیوں میں آواز رک جاتی ہے]

نواب شوکت ۔ [گھبراہٹ سے] ہائیں ! خاتون، کیا ؟

اجنبی خاتون وہ لے گئے ــــ میرا . . . . میرا . . . . بے . . . . . . بے

نواب شوکت تمہارا بے ؟

اجنبی خاتون ۔ مجھے بیگ کی تو پروا نہیں، میں اس کی طلبگار نہیں ــــ یقیناً میں جگ ہنسائی نہیں چاہتی [اس کا چہرہ تمتما رہا ہے] بے . . . . . کن، . . . . لیکن ــــ میری تمام پونجی اُس میں تھی۔

نواب شوکت کیا ؟ کس میں ؟

اجنبی خاتون ۔ بیگ کے اندر، میرے بٹوے میں، میرا قرمزی ریشمی بٹوا تھا . . . . ! یقیناً مجھے نہیں آنا چاہئے تھا ــــ میں جگ ہنسائی نہیں چاہتی ۔ لیکن مجھے اپنی پونجی ضرور ملنی چاہئے ! ــــ کیوں، کیا نہیں ملنی چاہئے ۔ ؟

نواب شوکت ۔ تمہارا مطلب یہ تو نہیں کہ . . . . میرا ۔ . . میرے بیٹے . . . . ؟

اجنبی خاتون ۔ اوہ، دیکھئے ! وہ آپ میں نہ . . . . ، میرا مطلب ہے . . . . ! [دل موہ لینے والی مسکراہٹ کے ساتھ]

نواب شوکت ۔ معاف کیجئے، میں سمجھا نہیں ۔

اجنبی خاتون [زمین پر پیر مارتے ہوئے] ہونہہ آپ نہیں سمجھے ! وہ مدہوش تھے، ــــ مجھ سے دنگا کرنے لگے۔

نواب شوکت [بےچینی سے] کیسے ؟ کہاں ؟

اجنبی خاتون [بےباکی سے] میرے گھر۔ ہم دونوں نے رات کا کھانا . . . . کھایا ــــ اور پھر آپ کے صاحبزادے . . . . !

نواب شوکت [گھنٹی کا بٹن دباتے ہوئے] کیا میں دریافت کرسکتا ہوں کہ یہ مکان آپ کو کیسے معلوم ہوا۔ کیا اُس نے آپ کو اپنا نام اور پتہ بتایا تھا۔

اجنبی خاتون [دوسری طرف نظریں جما کر] میں نے اُس کے لبادے کی جیب میں سے پڑھ لیا تھا۔

نواب شوکت [بناوٹی مسکراہٹ سے] ہونہہ ! لبادے کی جیب میں سے پڑھ لیا تھا۔ کیا میں دریافت کرسکتا ہوں کہ میرا لڑکا آپ کو روزِ روشن میں پہچان لے گا۔ ؟

اجنبی خاتون ۔ پہچان لیگا ؟ میں وثوق سے . . . . میرا مطلب ہے، وہ بے شک پہچان لیگا !

[شاہد کمرے میں داخل ہوتا ہے]

نواب شوکت ۔ صفدر سے کہو یہاں آئے [شاہد جاتا ہے

اِدھر نواب شوکت بے چینی سے اِدھر اُدھر ٹہلنے لگتا ہے۔] کتنے عرصے سے آپ کی اس سے ملاقات ہے ؟

اجنبی خاتون۔ یہی صرف ..... صرف گوڈ فرائیڈے سے

نواب شوکت۔ میں حیران ہوں کہ ... پھر یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ..... میں حیران ہوں کہ ......

[اجنبی خاتون پر نظر غائر ڈالتا ہے، جو آنکھیں جھکائے، ہاتھوں کو مروڑ مروڑ کر مسل رہی ہے یکایک صفدر کمرے میں داخل ہوتا ہے، خاتون کو دیکھ کر جھجکتا ہے، خاتون بے لغیتانہ مجنونانہ قہقہہ مارتی ہے ! — تھوڑی سی دیر خاموشی]

نواب شوکت [نفرت و غصے کے مرکب جذبے میں] یہ جوان — یہ ..... خاتون کہتی ہے کہ کل رات ..... میرا خیال ہے تم نے کل رات کہا تھا نا، خاتون ! — تم اڑا اکڑ !

اجنبی خاتون [گھبرا کر] میرا بیگ ! اور میری تمام جمع پونجی قرمزی ریشمی بٹوے میں تھی۔

صفدر۔ بیگ ! [کھسک جانے کا موقعہ ڈھونڈھتا اور ارد گرد نظریں دوڑاتا ہے]
میں کچھ نہیں جانتا

نواب شوکت [تیزی سے] اِدھر آؤ، سنو ! کیا کل رات تمہاری اس نوجوان خاتون سے ملاقات نہیں ہوئی ؟ [صفدر کو ہچر مچر کرتے دیکھ کر] ایک بات کہو، ہاں یا ناں [وقفہ] انکاری ہو ؟

صفدر۔ انکاری ! نہیں، ہرگز نہیں [خاتون سے سرگوشی کرتے ہوئے] تم نے کس بری طرح میرا راز افشا کر ڈالا ! تم یہاں آئیں کیوں ؟

اجنبی خاتون [آبدیدہ ہو کر] یقیناً میں نہیں جانتی تھی کہ ..... یہ ممکن نہیں ! — — کیوں، — ہے نا؟
آپ نے اُسے میرے ہاتھ سے چھین لیا — کیوں چھینا تھا کہ نہیں ؟ — اور بٹوے میں میری تمام جمع پونجی تھی۔ کل رات تو آپ کے تعاقب میں اس لئے نہیں آئی کہ میں جگ ہنسائی نہیں چاہتی تھی، اور پھر رات بھی زیادہ آگئی تھی، اور آپ بھی ..... اسقدر ..... !

نواب شوکت۔ اِدھر دیکھئے [طنز سے] ابھی جناب، مجھ سے بات کیجئے ! — بتائیے، کیا معاملہ ہے ؟

صفدر [پریشان ہو کر] مجھے اس کی بابت کچھ یاد نہیں [خاتون سے بہت ہی دبی لجھائی ہوئی آواز میں] لللہ یہ کیا کیا ! تم نے خط کیوں نہ لکھ دیا۔

اجنبی خاتون [برہمی اور اُداسی کے مشترک جذبات میں مغلوب ہو کر] میں ابھی چاہتی ہوں، میں ضرور لوں گی۔ مجھے آج کرایہ دینا ہے۔ [نواب کی طرف دیکھتے ہوئے] وہ ایسے لوگوں کو دیکھ کر ہر وقت خوش ہوتے ہیں جو — جو امیر نہیں ہوتے

صفدر۔ مجھے حقیقتاً اسکی بابت کچھ یاد نہیں رہا۔ مجھے کل رات کی بابت کچھ بھی یاد نہیں [سر پر ہاتھ رکھ کر سوچتے ہوئے] یہ تمام مبہم ہے ! — سر مارے درد کے پھٹا جا رہا ہے۔

اجنبی خاتون۔ لیکن آپ چھین کر لے آئے تھے، یاد کیجئے آپ بخوبی جانتے ہیں کہ آپ لے آئے تھے۔ آپ نے کہا کہ تم کو الٹی نہلاؤں گا۔

صفدر اچھا، تو، وہ یہاں ضرور ہوگا، ہاں، اب مجھے یاد آیا — مجھے کچھ کچھ یاد آرہا ہے لیکن ..... اس ناشدنی چیز کو میں نے کیوں چھینا تھا ؟

نواب شوکت جی ہاں، آپ نے اس ناشدنی چیز کو کیوں ! — [دستانے کی طرف رخ پھیر لیتا ہے]

اجنبی خاتون۔ [دلآویز موہ لینے والی مسکراہٹ سے] آپ ہوش میں نہ ..... کیوں ! — کیا تھے ؟

صفدر۔ [بے زار مسکراہٹ کے ساتھ] میں سخت نادم ہوں، میرے لایق کوئی کارِ خدمت ...؟

نواب شوکت۔ کارِ خدمت ؟ بس آپ اس کا مال ابھی واپس کر دیں۔ تو آپ کے حق میں بہتر ہوگا۔

صفدر۔ میں جا کر تلاش کرتا ہوں۔ لیکن یقیناً

جہاں تک مجھے خیال ہے میرے پاس نہیں۔!

[وہ لمبے لمبے قدم ڈالتا ہوا جلدی سے باہر جاتا ہے۔ نواب شوکت کرسی پیش کرتا ہے اجنبی خاتون سے بیٹھنے کا اشارہ کرتا ہے۔ خاموش کھڑے کھڑے تکتی جائے اسے دیکھتا ہے — وہ بیٹھ جاتی ہے — کن انکھیوں سے نظر بچا کر اسے دیکھتی ہے منہ پھیر کر منہ پر نقاب ڈالتی اور چپکے سے آنسو پونچھتی ہے — صفدر واپس آجاتا ہے]

صفدر۔ [روئی صورت بنائے خالی بیگ دکھاتے ہوئے] یہ، ہی وہ بیگ ہے؟ میں نے تمام گھر ڈھونڈ مارا۔ بٹوا کہیں بھی نہ ملا۔ کیا تمہیں یقین ہے۔ [بیگ دکھا کر] وہ اسی میں تھا؟

اجنبی خاتون [آبدیدہ ہو کر] یقین! — بے شک مجھے کامل یقین ہے۔ قرمزی ریشمی بٹوا تھا — میری کل جمع پونجی اسی میں تھی۔

صفدر میں سخت نادم ہوں — سر میں سخت درد ہے۔ خانساماں سے دریافت کیا، لیکن اُس نے بھی نہیں دیکھا۔

اجنبی خاتون۔ میں اپنی رقم ضرور لوں گی — میں لیکر ہی . . . . .

صفدر۔ اوہ! بے شک — کیوں نہیں، سب ٹھیک ہو جائیگا، میں کوشش کروں گا، انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا . . کتنی . . . . ؟

اجنبی خاتون۔ کل سات اشرفیاں اور بارہ روپے — بس یہی جمع پونجی میری زندگانی تھی۔

صفدر۔ ہاں، یہ سب ٹھیک ہو جائیگا، میں . . . . . نہیں ایک . . . . چیک بھیج دوں گا۔

اجنبی خاتون۔ [کمال آرزو سے] نہیں، جناب ابھی دیدیجئے نا! جو کچھ میرے بٹوے میں تھا عنایت کر دیجئے۔ مجھے آج صبح کو کرایہ دینا ہے کرایہ پندرہ دن سے واجب الادا ہے اب وہ مجھے ایک دن کی بھی مہلت نہیں دیں گے۔

صفدر۔ [افسردہ خاطر ہو کر] مجھے سخت افسوس ہے، مگر . . . . . اب تو میری جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔ [کن انکھیوں سے نواب شوکت کو دیکھتا ہے۔]

اجنبی خاتون [پُر جوش لہجے میں] دیکھئے، میں کہتی ہوں کہ آپ کو ضرور — — — میرا مال، آپ نے چھین لیا۔ میں اسے لئے بغیر نہیں جا سکتی مالک مکان مجھے دھکے دے کر نکال دیگا۔

صفدر۔ [اپنا سر پکڑ کر] لیکن میں تمہیں نہیں دے سکتا۔ جو میرے پاس نہیں ہے وہ تم کو کیسے دے دوں۔ کیا میں نے نہیں کہا کہ میرے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں؟

اجنبی خاتون [دستی سے آنسو پونچھتے ہوئے] اُف! مہربانی سے عنایت کر دیجئے! [ہاتھ جوڑ کر التجا کرتی ہے اور پھر فوری جوش اور جذبے کے ساتھ!] اگر آپ نہ دیں گے تو میں دعویٰ کر دوں گی۔ یہ چوری ہے — بے شک، یہ چوری ہے۔

نواب شوکت۔ [اضطراب و بےچینی سے] خاتون! ایک منٹ، — سچ تو یہ ہے — — — اصولاً اس معاملے کا چکا دینا میرا فرض ہے یہ لیجئے اپنی رقم — [رقم نکالتے ہوئے] یہ آٹھ تو اپنا لیجئے، اور باقی رقم آپ کے بٹوے کی قیمت، زادِ راہ اور گاڑی کے کرایہ کے لئے ہے۔

بس اب اور کیا چاہیئے [خاتون کے شکر گزار
چہرے پر نظر ڈال کر] کسی شکریہ کی ضرورت نہیں
ہے۔ [گھنٹی بجاتے ہوئے، خاموشی سے دروازہ
کھول کر الگ کھڑا ہو جاتا ہے۔ اجنبی خاتون
اشرفیاں بیگ میں رکھ کر ایک نظر صفدر
پر ڈال کر نواب شوکت کو دیکھتی ہے۔ اس کا
چہرہ خوشی کے مارے دمک رہا ہے۔ خندۂ
بے اختیار کو ہاتھوں سے ڈھانکتی اور روکتی
ہوئی باہر کھسک جاتی ہے۔ اس کے نکلتے ہی
نواب شوکت دروازہ بند کر دیتا ہے۔

نواب شوکت [سنجیدگی سے صفدر سے مخاطب ہو کر]
ہونہہ! کتنا اچھا واقعہ ہے!

صفدر۔ [کھوئے ہوئے انداز سے] آہ! بدبختی!
کیسی بری قسمت ہے!!

نواب شوکت۔ خوب! اچھا تو اسطرح وہ چالیس
اشرفیاں ختم ہوئیں! ۔ ۔ ۔ ایک خطا کے
بعد دوسری ایک بار میں پھر معلوم کرنا چاہتا ہوں
کہ اگر مجھ جیسا معزز باپ تمہارا نہ ہوتا اور میرا نام
و نمود درمیان نہ ہوتا تو اس واقع پر تم کہاں
ہوتے! تمہارا تو کوئی اصول ہی نہیں معلوم
ہوتا۔ تم ۔ ۔ ۔ تم ان لوگوں میں سے ہو جو
سوسائٹی کے لئے لعنت ہیں، تم ۔ ۔ ۔ بڑے
خطرناک ہو! نہ جانے تمہاری والدہ کیا
کہیں گی۔ تمہاری عادات و اطوار میری نظر
میں بالکل گرے ہوئے اور خلاف قانون،
ہیں یہ ۔ ۔ ۔ یہ سنگین جرم ہے۔ اگر کوئی مفلس
ایسی حرکت کر بیٹھتا تو ۔ ۔ ۔ تمہارے خیال
ہیں، ۔۔ کیا قابل معافی ہو سکتا؟ تم کو ایک
اچھے سبق کی ضرورت ہے تم اور تم جیسے ۔
[غصے سے بے اختیار ہو کر] ۔۔ قوم کے
لئے لعنت ہیں۔ آئندہ مجھ سے مدد کی تمنا
نہ رکھنا۔ تم مدد کے قطعی قابل نہیں۔

صفدر۔ [باپ کی جانب خلاف توقع وحشتناک
انداز سے دیکھ کر] بہت بہتر پھر کبھی نہیں۔۔
میں بھی دیکھوں گا کہ آپ کیسے گوارا کرینگے
میں خوب جانتا ہوں اگر اس معاملے کی اخباروں
میں آ جانیکا خوف نہ ہوتا تو آپ اب بھی مجھے
نہ بچاتے ۔۔ سگریٹ کہاں ہیں؟

نواب شوکت [بہت بے اطمینانی سے دیکھتے ہوئے]
خیر! ۔۔ اس معاملہ میں اب کچھ نہیں کہونگا،
[گھنٹی بجاتا ہے] اس دفعہ تو درگزر کرتا ہوں
لیکن ۔ ۔ ۔ ۔ [شاہد داخل ہوتا ہے] آپ
تشریف لیجا سکتے ہیں [اپنے منہ کے سامنے
"اخبار ٹائمز" کی اوٹ کر لیتا ہے۔

صفدر [خوش ہو کر] شاہد! سگریٹ کہاں ہیں۔؟

شاہد۔ سرکار! کل رات میں نے وسکی کے ساتھ
سگریٹ کیس بھی رکھا تھا، لیکن آج صبح جو
دیکھتا ہوں تو ندارد۔ بہتیرا تلاش کیا [صفدر کی
طرف معنی خیز نظریں دوڑاتے ہوئے] لیکن
سرکار کہیں بھی نہ ملا

صفدر۔ میرے کمرے میں بھی ڈھونڈا

شاہد۔ جی ہاں! سرکار میں نے تمام گھر چھان مارا: البتہ
۔۔۔ آج صبح کشتی میں سے ویسٹ سگریٹ کے
دو جلے ہوئے چھوٹے سگریٹوں کے ٹکڑے تو ضرور
ملے تھے۔ اس لئے اتنا تو ظاہر ہے کہ کل رات
آپ ضرور سگریٹ پی رہے تھے۔ لیکن [رک
رک کر] حقیقتاً مجھے اندیشہ ہے ۔ ۔ ۔ کسی
صفدر نے چرا نہ لیا ہو۔

نواب شوکت [فقط سن لوٹا ہو کر] کیا معاملہ ہے۔
سگریٹ کیس چرا لیا؟ لو کچھ اور بھی گم ہو گیا؟

شاہد۔ [چندرا کر] نہیں سرکار، پلیٹ صاف کرتا

نواب شوکت۔ کیا آج صبح گھر بالکل ٹھیک حالت میں

تھا؟ کوئی کھڑکی کھلی تو نہ تھی؟

شاہد۔ نہیں سرکار، [زیرلب صفدر سے]
سرکار، کل رات آپ اپنی کنجی دروازہ ہی میں لگی چھوڑ کر بھول گئے تھے! یہ لیجئے [نواب شوکت کی نظر بچا کر کنجی صفدر کے حوالے کرتا ہے]

صفدر۔ (زیر لب) شو ـ ـ ـ ـ شو!

نواب شوکت۔ آج صبح کمرے میں کون کون آیا تھا؟

شاہد۔ سرکار! جہاں تک مجھے دھیان ہے صرف کنیز، میں اور حشمت

نواب شوکت۔ کیا تم نے بیگم سے دریافت کیا؟
(صفدر سے) ذرا جاؤ تو! اپنی والدہ سے دریافت کرو شاید ان کے پاس ہو، ہاں، اور کہنا کہ اپنی چیزیں اچھی طرح دیکھ بھال لیں۔ کہیں ان کی بھی اور کوئی چیز نہ کھوگئی ہو۔ [صفدر ماں کے پاس جاتا ہے] پیپروں کا ایک بیگ گم ہو جانا بڑے غضب کی بات ہے
بھلا اس سے بھی زیادہ کوئی پریشانی یا تکلیف ہو سکتی ہے؟

شاہد۔ نہیں سرکار!

نواب شوکت۔ تمہیں کسی پر شک شبہ ہے۔

شاہد۔ نہیں سرکار۔

نواب شوکت۔ یہ حشمت کب سے کام کر رہی ہے؟

شاہد۔ سرکار، صرف پچھلے مہینے سے۔

نواب شوکت۔ کس قماش کی ہے؟

ایکٹ اول منظر تیسرا

شاہد۔ سرکار، اس کی بابت کچھ زیادہ تو نہیں جانتا، لیکن بظاہر بہت کم سخن اور نیک عورت ہے،

نواب شوکت۔ آج صبح کمرے کو کس نے صاف کیا تھا۔

شاہد۔ سرکار، کنیز اور حشمت نے۔

نواب شوکت۔ [انگشت شہادت اوپر اٹھا کر] اچھا، ٹھیرو، کیا تھوڑی دیر کو حشمت کمرے میں اکیلی بھی تھی۔

نواب شوکت۔ آج صبح کو کمرہ کس نے صاف کیا تھا؟

شاہد۔ سرکار، کنیز اور حشمت نے۔

نواب شوکت (انگشت شہادت اوپر اٹھا کر) اچھا ٹھیرو کیا تھوڑی دیر کو حشمت کمرے میں اکیلی بھی تھی۔

شاہد۔ [مذبذب کھوئے ہوئے انداز میں] جی ہاں، سرکار!

نواب شوکت۔ یہ تمہیں کیونکر معلوم ہوا؟

شاہد۔ [بادل ناخواستہ] سرکار، میں نے اُسے یہاں دیکھا تھا۔

نواب شوکت۔ اور کیا کنیز بھی کمرے میں اکیلی تھی۔

شاہد۔ (گھبرا کر) نہیں نہیں، سرکار! وہ نہیں!! میں یہ عرض کرتا ہوں سرکار! حشمت بہت ایماندار عور ـ ـ ـ ـ

نواب شوکت [اپنا ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوئے بات کاٹ کر] میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آیا حشمت نے صبح کا سارا وقت یہاں گزارا؟ کہیں گئی تو نہیں؟

شاہد۔ ہاں سرکار، ـ ـ ـ نہیں، سرکار! ——
وہ باورچی کے لئے کنجڑے کی دوکان تک گئی تھی۔

نواب شوکت، ہونہہ کیا اس وقت گھر میں موجود ہے؟

شاہد۔ جی ہاں، سرکار۔

نواب شوکت۔ بالکل ٹھیک! تو پھر ـ ـ ـ اب اس معاملہ کی اچھی طرح جانچ پڑتال کر کے اصل واقعے کا کھوج لگانا اور روشنی میں لانا میرا پہلا کام ہوگا بے شک، میرا فرض ہے کہ خطاکار ملازم کو ڈھونڈ نکالوں۔ گھر کی حفاظت اور سامان کی نگرانی کا بنیادی پتھر بھی تحقیقات ہے ـ ـ ـ تم سب کے بھلے کے لئے ـ!

(باقی آئندہ)

میں

یعنی

انسانِ کامل

حضرت مرزا نظام شاہ صاحب لبیب دہلوی مدظلہ

ہیں سب رنگ میرے وہ بے رنگ ہوں میں
نگارندۂ نقش ارژنگ ہوں میں

ہے یکساں ہر اک شے پہ فیضانِ ہستی
ترازوئے فطرت کا پاسنگ ہوں میں

ہزاروں ہیں پرکاریاں سادگی میں
کہ سطحِ تصور پہ نیرنگ ہوں میں

نشیب و فراز نوا ہے یہ عالم
نواہائے عالم کی آہنگ ہوں میں

اِدھر ہے خودی اور اُدھر ہے خدائی
سراپردۂ صورت و رنگ ہوں میں

کفِ لالہ و گل میں ہوں جامِ رنگیں
طپیدہ شرارِ دلِ سنگ ہوں میں

نظر ٹھیری جاتی ہے اِک اِک افق پر
جہاں تنگ ہے اس سے دل تنگ ہوں میں

خدا و خودی ہیں دعاگوئے دولت
نمائندۂ تاج و اورنگ ہوں میں

لبیب آنے والی ہیں بیداریاں بھی
ابھی سوزِ خوابیدۂ چنگ ہوں میں

عہدِ رفتہ کی صدائے بازگشت

مختصر تاریخ لکھنؤ

لکھنؤ کی ابتدائی حالت اگرچہ اس خوبصورت شہر کی مسلمانوں کے حملہ سے قبل صحیح تاریخ نہیں معلوم ہوسکی ہے لیکن پھر بھی قدیم روایات سے سنا جاتا ہے کہ یہاں اجودھیا کے راجہ رام کے چھوٹے بھائی حکومت کرتے تھے اور جنھوں نے اپنے نام پر اس کا نام لکشمن پور رکھا۔ ایک اونچے ٹیلہ پر مچھی بھون کے بالمقابل ایک قلعہ تعمیر کرایا جو آجکل لچھمن ٹیلہ کے نام سے موسوم ہے اور جہاں آج کنگ جارج میڈیکل کالج بنا ہوا ہے۔

جب محمود غزنوی نے ہندوستان پر حملہ کیا تو اس کے ایک جنرل سید سالار نے لکشمی پور کو فتح کیا اور اس کے بعد مچھی بھون کے سامنے مسلمان آ آ کر بسنے لگے اور یہ ایک مختصر سی آبادی بن گئی۔ رفتہ رفتہ یہ مسلمانوں کا ایک طاقت ور مقام ہو گیا۔

لکھنؤ کی تاریخ ترقی جب نواب آصف الدولہ نے اودھ کے پایۂ تخت کو فیض آباد سے لکھنؤ میں منتقل کرایا تو سنہ ۱۷۷۵ء میں لکھنؤ ایک خوشنما شہر بن گیا۔ آصف الدولہ نے لکھنؤ کو وسیع کرنے کے لئے جو اس وقت صرف ایک گاؤں کی حیثیت رکھتا تھا متعدد تدابیر سوچیں اور آخرکار اسی کی وہ ہستی تھی جس نے چھوٹی سی آبادی ایک خوبصورت شہر میں تبدیل کر دی۔

حکومت اودھ کی بنیاد۔ سعادت علی خاں برہان الملک سنہ ۱۷۳۲ء تا سنہ ۱۷۳۹ء

اودھ کی سلطنت کا بانی ایک ایرانی سعادت علی خاں برہان الملک تھا۔ جس زمانہ میں محمد شاہ دہلی کا شہنشاہ تھا۔ سعادت خاں اپنے باپ اور بڑے بھائی کے ساتھ بحیثیت ایک تاجر کے ہندوستان آیا اور دربار دہلی تک رسائی حاصل کی۔ اس کی قسمت کا ستارہ اوج پر تھا ــــ اپنی چرب زبانی سے مغل شہنشاہ کے دل میں جگہ کر لی جو سعادت خاں پر اتنا مہربان ہوئے کہ اوس کو اودھ کا حاکم مقرر کر دیا۔ اس عہدہ پر فائز ہونے کے بعد سعادت خاں نے راجاؤں اور جاگیرداروں کو جو شہنشاہ دہلی کے مخالف ہو رہے تھے اپنی لیاقت اور ہوشیاری سے مغلوب کر لیا۔ اس نے اپنا پایۂ تخت فیض آباد رکھا اور شیخوں سے قلعہ کو جسکا نام لکشمن گڑھی تھا چھین کر اس کا نام مچھی بھون رکھا اور جب ہی سے مچھی اودھ کا مخصوص نشان ہے۔

مغلیہ خاندان کی لاتعداد دولت کو دیکھ کر سعادت خاں نے ایران کے بادشاہ نادر شاہ درانی کو تخت دہلی پر قابض ہونے کی دعوت دی۔ لیکن نادر شاہ نے صاف جواب دے دیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس جواب سے اس کو بہت شرمندگی ہوئی اور اسی بنا پر اس نے زہر کھا کر خودکشی کر لی اس طرح سے اودھ کی حکومت کے بانی کا چراغِ زندگی گل ہو گیا۔

منصور علی خاں صفدر جنگ (۱۷۳۹ء تا ۱۷۵۳ء)

منصور علی خاں صفدر جنگ سعادت علی خاں کے داماد اس کے بعد جانشین مقرر ہوئے۔ اپنے چچا اور خسر کے نقش قدم پر چلکر انھوں نے بھی دربار دہلی میں بہت کچھ اقتدار حاصل کیا اور تھوڑے ہی عرصہ میں شہنشاہ دہلی انکے وزیر اور اودھ کے حاکم مقرر کردیئے گئے۔ اپنی عمر کا زیادہ حصہ فیض آباد ہی میں گذارا اور وہی انکا پایۂ تخت رہا۔ آخر ۱۷۵۳ء میں دنیا سے کوچ کر گئے۔ اور دہلی کے مشہور مقبرے میں دفن ہوئے جو اب بھی صفدر جنگ مقبرہ کے نام سے مشہور ہے۔

شجاع الدولہ (۱۷۵۳ء تا ۱۷۷۵ء)

منصور علی خاں کی موت کے بعد شجاع الدولہ جانشین قرار پائے۔ یہ اپنی جسمانی طاقت اور فوجی انتظام میں بہت مشہور تھے۔ شاہ عالم سے ملکر حکومتِ برطانیہ کی مخالفت میں میر قاسم سے لڑنے کو روانہ ہوئے لیکن انھوں نے بری طرح زک اٹھائی اور بریلی بھاگ آئے۔ اس طرح اُن کے ہاتھ سے اودھ کی حکومت کی لگام چھوٹ گئی۔ لیکن تھوڑے عرصہ بعد وہ لارڈ کلایو سے صلح کے خواستگار ہوئے۔ جس نے تاوان جنگ لیکر دوبارہ اودھ کی حکومت پر سند نشین کیا اس طرح برطانیہ کا اثر و اقتدار صوبہ اودھ پر روز بروز بڑھنے لگا۔ ۱۷۷۵ء میں فیض آباد میں انتقال کیا اور وہیں ایک مقبرے میں دفن کئے گئے۔

آصف الدولہ (۱۷۷۵ء تا ۱۷۹۷ء)

شجاع الدولہ کے بعد انکے لڑکے آصف الدولہ تخت اودھ کے جانشین مقرر کئے گئے۔ یہ اپنی سخاوت اور دریا دلی میں بہت مشہور تھے اور اب بھی لکھنؤ کے ہر خاص و عام کی زبان پر ان کی سخاوت کا تذکرہ اکثر رہتا ہے۔ تخت نشین ہونے کے تھوڑے دن بعد آصف الدولہ نے اپنا دارالسلطنت فیض آباد سے لکھنؤ میں منتقل کرالیا اور اس چھوٹی سی بستی میں چار چاند لگا دیئے۔ انھوں نے بہت سی عمارتیں اور محلات تعمیر کروائے جن میں سب سے خوبصورت بڑا امام باڑہ ہے جس کو ۱۷۸۴ء کے زبردست قحط میں بھوکی رعایا کی پرورش کی غرض سے تعمیر کروایا۔ آخر ۱۷۹۷ء میں انتقال کیا اور بڑے امام باڑے میں دفن کئے گئے۔

سعادت علی خاں (۱۷۹۸ء تا ۱۸۱۴ء)

سعادت علی خاں اپنے سوتیلے بھائی آصف الدولہ کے بعد جانشین مقرر ہوئے۔ اور ۱۸۱۴ء تک حکومت کی لیکن سعادت علی خاں کے تخت نشین ہونے سے قبل آصف الدولہ کا عیاش طبع اور ناقابل لڑکا وزیر علی تخت و تاج کا وارث بن بیٹھا مگر اس معاملہ کو برطانوی حکومت نے اپنے ہاتھ میں لے لیا اور سعادت علیخاں کو تاج کا وارث قرار دیا۔ سعادت علیخاں ایک ماہر اور روشن دماغ حکمراں ثابت ہوئے۔ انھوں نے شہر میں متعدد عمارات تعمیر کرائیں قیصر باغ کے شمال مشرق میں بڑے مقبرے میں دفن ہیں اور چھوٹے میں انکی اہلیہ خورشید زیدی دفن ہیں۔

غازی الدین حیدر شاہ سنہ ۱۸۱۴ء تا سنہ ۱۸۲۷ء

سنہ ۱۸۱۴ء میں غازی الدین حیدر باپ کی جگہ گدی نشین کیے گئے۔ اپنے آباؤ اجداد کی طرح انھوں نے بھی متعدد عمارتیں تعمیر کرائیں۔ ان میں شاہ نجف فن تعمیر کا ایک نادر نمونہ ہے۔
سنہ ۱۸۱۹ء میں لارڈ ہیسٹنگز نے غازی الدین کو نواب سے بادشاہ مقرر کیا۔ اس طرح غازی الدین حیدر اودھ کے اول بادشاہ ہوئے۔ سنہ ۱۸۲۷ء میں فرحت بخش محل میں انتقال کیا اور شاہ نجف میں دفن کیے گئے۔

شاہ ناصر الدین حیدر (سنہ ۱۸۲۷ء تا سنہ ۱۸۳۷ء)

سنہ ۱۸۲۷ء میں غازی الدین کے انتقال کے بعد ان کے لڑکے ناصر الدین حیدر تخت نشین ہوئے۔ ناصر الدین ایک عیاش طبع بادشاہ تھے۔ شراب، افیون اور حرم کی کنیزوں کے علاوہ اور کسی چیز سے انس نہ تھا۔ ان کی طبیعت میں زنانہ خمیر شامل تھا کیونکہ انکی گفتگو اور ان کے طور طریقے عورتوں کے مثل تھے۔ دوبارہ ہر ہمیشہ یورپ کے سیاح موجود رہتے تھے۔ انہی وجوہات کی بناء پر ان کے وزرا اور اہل دربار ان کے مخالف رہتے اور اندر ہی اندر حسد کیا کرتے۔ لیکن اتنا ہوتے ہوئے بھی ناصر الدین نے بیشتر وشاہان اودھ کی طرح چند عمارات تعمیر کرائیں جن میں آجکل انکی بنوائی ہوئی رسدگاہ میں امپیریل بینک آف انڈیا قائم ہے۔ آخر ان کی عیاشی کی بناء پر سنہ ۱۸۳۷ء میں درباریوں نے ان کو زہر دے دیا۔ یہ ماہ نگر کی کربلا میں دفن کیے گئے۔

محمد علی شاہ (سنہ ۱۸۳۷ء تا سنہ ۱۸۴۲ء)

ناصر الدین حیدر کے انتقال کے بعد انکی سوتیلی ماں نے اپنے لڑکے منا جان کی تاجپوشی کیلئے بہت زبردست کوشش کی لیکن برطانوی سفیر نے اپنی انتھک کوششوں سے ناصر الدین کے چچا محمد علی شاہ کو سنہ ۱۸۳۷ء میں تخت و تاج کا وارث مقرر کیا۔ بادشاہ بیگم مایوس ہوگئیں۔ محمد علی شاہ ضعیف اور ناتواں ہوتے ہوئے بھی بہت قابل اور منصف مزاج حکمراں ثابت ہوئے اور اپنی حکومت کے پانچ سال کی قلیل مدت میں متعدد عمارتیں تعمیر کرا کے لکھنؤ کی خوبصورتی اور شان و شوکت کو دوبالا کر دیا۔ حسین آباد کا امام باڑہ ـــــ حسین آباد کا تالاب۔ اور جمعہ مسجد وغیرہ تعمیر کرائیں۔ آخر سنہ ۱۸۴۲ء میں رحلت کر گئے اور حسین آباد کے امام باڑہ میں دفن ہوئے۔

امجد علی شاہ (سنہ ۱۸۴۲ء تا سنہ ۱۸۴۷ء)

محمد علی شاہ کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے امجد علی شاہ سنہ ۱۸۴۲ء میں تخت نشین ہوئے۔ باپ کی طرح انھوں نے بھی پانچ سال حکمرانی کی۔ امجد علی شاہ کو شاہی امور اور حکومت کے افعال سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی بلکہ زیادہ تر وقت حرم ہی میں گزرتا تھا۔ حکومت میں اتنی بدنظمی ہوتے ہوئے بھی انھوں نے اپنے آبا و اجداد کی طرح چند عمارتیں بنوائیں۔ انھوں نے اپنا مقبرہ جو امجد علی شاہ کے مقبرہ کے نام سے موسوم ہے بنوایا تھا اور لوہے والا پل بھی امجد علی شاہ ہی نے تیار کروایا تھا۔ سنہ ۱۸۴۷ء میں وفات پائی اور اپنے بنائے ہوئے مقبرہ واقع حضرت گنج میں دفن کیے گئے۔

واجد علی شاہ (سنہ ۱۸۴۷ء تا سنہ ۱۸۵۵ء)

امجد علی شاہ کی وفات کے بعد ان کے لڑکے واجد علی شاہ سنہ ۱۸۴۷ء میں تخت نشین مقرر کئے گئے۔ یہ آخری تاجدار اودھ تھے۔ انھوں نے لاتعداد عمارتوں سے مشتمل قیصر باغ ایک کروڑ روپیہ میں تعمیر کروایا۔ کہا جاتا ہے کہ اپنی حکومت کے ابتدائی دور میں واجد علی شاہ نے نہایت عمدگی اور خوبصورتی سے حکمرانی کی لیکن ایک ہی سال بعد درباریوں کے ہاتھوں میں پڑ گئے۔ اور اپنا تمام قیمتی وقت عیاشی میں صرف کرنے لگے۔ ان کے حرم میں رباب و چنگ کی دلکش آوازیں مغنیوں کی سریلی تانیں اور رقاصاؤں کے گھنگروؤں کی جھنکاریں سنائی دیتی تھیں۔ دوسرے سال سے انھوں نے کبھی بھی حکومت کی باگ ڈور نہ سنبھالی۔ اس کی پروا بھی نہ کی کہ رعایا پر کیا تکلیفیں گزر رہی ہیں۔ ملک میں ہر طرف بدامنی پھیل گئی۔ ان کی حکومت در اصل وزراء کے ہاتھوں میں تھی۔ اور وہ جو چاہتے تھے کرتے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان کی ۳۸۵ بیویاں تھیں۔

سنہ ۱۸۵۵ء میں حکومت برطانیہ نے ان کو قید کر کے کلکتہ بھیج دیا اور مٹیا برج میں نظر بند کر دیئے گئے۔ آخر سنہ ۱۸۸۷ء میں انتقال کیا۔

(شمیم ہاشمی لکھنوی)

ارشادِ ارشدی

جناب محبوب الحسن ارشدی بدایونی

وہ چاہیں بھی تو اب میری پریشانی نہیں جاتی	کچھ ایسی بات ہے یہ بات جو مانی نہیں جاتی
جو حالت آئینہ کی ہے وہی آئینۂ دل کی	کہ جلوہ سامنے ہے پھر بھی حیرانی نہیں جاتی
انہیں اس میں بھی کچھ شک ہے کہ جینا مجھ کو دوبھر ہے	تو گویا ماننے کی بات بھی مانی نہیں جاتی
ہمارے دل سے وابستہ رہے گی دل کی بربادی	یہ گھر جب تک ہے گھر سے خانہ ویرانی نہیں جاتی
اگر جینے سے ناخوش ہیں تو ہم جی سے گزر جائیں	یہ جھوٹی ناخوشی تو ناخوشی مانی نہیں جاتی
ہزاروں آشیاں پھونکے ہزاروں دل جلا ڈالے	مگر اے عشق تیری شعلہ سامانی نہیں جاتی
اِدھر توفیقِ ضبطِ آہ وحشیوں گھٹتی جاتی ہے	اُدھر سرمایۂ غم کی فراوانی نہیں جاتی
سمجھتا ہوں کہ یہ رسوا کن ضبطِ محبت ہے	مگر اس پر بھی میری چاک دامانی نہیں جاتی
گرانی پر گرانی بڑھ رہی ہے قدرِ الفت کی	مگر نذرِ متاعِ دل کی ارزانی نہیں جاتی
وہ جب تک دل دکھائیں گے رہینگے اشک بھی جاری	فغان و آہ سے یہ گریہ سامانی نہیں جاتی

محبت کی مصیبت ارشدی ایسی مصیبت ہے
نہ جب تک جان جائے یہ پریشانی نہیں جاتی

کیفِ نشاط

مسیح الکلام فخر الاطبا حکیم ہاشم جان صاحب کیفؔ دہلوی

۳۰ نومبر سنہ ۳۰ء کی شب کو قصبہ بلغپت ضلع میرٹھ، مشاعرہ میں پڑھی گئی حاضرین میں نہایت کامیاب اثر پائی تھی چنانچہ قارئین الہام کے تفنن طبع کیلئے درج ذیل ہے۔ شہاب

کیا بتائیں کہ ترے ہجر میں کیا کیا دیکھا　　خونِ دل خونِ جگر خونِ تمنا دیکھا

دید سے پہلے تو اوسان بھی تھے جان بھی تھی　　اب تو یہ بھی مجھے معلوم نہیں کیا دیکھا

تم تو بجلی بھی، بھبوکا بھی، قیامت بھی ہو　　دیکھنے والے کا بھی تم نے کلیجہ دیکھا

کہیے جان و دل و ایماں کہ جگر نذر کروں　　اِک نگاہِ غلط انداز میں کیا کیا دیکھا

تابِ نظّارہ گئی، ہوش اڑے، طور جلا　　ربِّ ارنی کا کلیمؑ آج نتیجہ دیکھا

کھینچ لی دیدۂ مشتاق نے تصویرِ جمال　　اک پسِ مردہ کو ہم نے سرِ پردہ دیکھا

تو نہیں تھا تو ترے حُسن کا تھا خود یہ گماں　　آج اپنا تری نظروں سے تماشا دیکھا

غیر تو غیر تمہیں بھی نہ رہا میرا خیال　　بزم کی بزم کا بدلا ہوا نقشہ دیکھا

تیرے بدلے ہوئے تیور نے بنا دی دم پر　　موت دیکھی کہ تجھے جانِ تمنا دیکھا

دیکھ کر جام بکف مجھ کو سرِ شام طلوع
کیفؔ ہر ذرہ پکارا یدِ بیضا دیکھا

جگنو

شام کا وقت تھا۔ دن بھر کی مصروفیتوں سے اکتا کر میں نے اپنی طبیعت کی بدمزگی کو درست کرنے کے لئے ذرا درشت لہجہ میں "عزیز" کو آواز دے کر چائے لانے کے لئے کہا۔

عزیز چھریرے اور خوبصورت بدن کا ایک وجیہہ جوان ہے۔ اس کی عمر بھی مجھ سے کچھ زیادہ ہی ہوگی لیکن آقا ہونے کی حیثیت سے مجھے اس بات کے سوچنے کا کم اتفاق ہوتا ہے۔

چائے میز پر رکھ دی گئی۔ میں نے نہایت بے پروائی سے چائے پر نظر ڈالتے ہوئے عزیز کی طرف دیکھا دروازے کے قریب کھڑا تھا اور شاید مجھ سے کچھ کہنے کیلئے موقع کا منتظر تھا۔

ہوں، "کیوں کھڑے ہو تم؟ جاؤ کام کرو، ضرورت ہوگی تو آواز دے لوں گا"

"مجھے کچھ کہنا ہے آپ سے"؟

ہوں۔ ہاں کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟"

میں آج اپنے گھر پر ہی رہوں گا میری بہن بیمار ہے

" ہوں۔ بہن بیمار ہے تو کیا ہوا۔ کل دن میں اسے ہسپتال لے جانا رات کو گھر پر رہنے کی کیا ضرورت ہے"؟ میں نے اپنی طبعی خودغرضی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

" میاں! وہ بہت بیمار ہے اس لئے میرا رات کو گھر پر ٹھہرنا ضروری ہے"

ارے تو میں کیا کروں۔ کیا تمہارے گھر پر کوئی دوسرا آدمی اس کی خبر لینے والا نہیں ہے؟

تمہاری بہن کی شادی نہیں ہوئی؟ اس کے شوہر کو کیا ہوا؟" معلوم نہیں میں نے اس طرح کے کتنے سوالات کر ڈالے۔

اچھا میاں! "میں نہ جاؤں گا" اس نے مزید سوالات کی بوچھاڑ سے بچنے کے لئے کہا اور میرے سامنے سے چلا گیا۔

عزیز کے متعلق میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ بیوی کے بعد میں صرف اس کی ضرورت کو زیادہ محسوس کرتا ہوں اس لئے اس کو کسی بات سے آزردہ ہوتے دیکھنا میرے لئے بہت دشوار ہو جاتا ہے۔

رات کے کھانے پر میں نے اس سے پوچھ ہی لیا "کیا واقعی آج تمہارا گھر پر رہنا ضروری تھا"!

جواب دینے کی بجائے وہ گردن جھکائے خاموش کھڑا رہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اندرونی کرب و اضطراب اس کے لئے ناقابل برداشت ہے" کیونکہ اس کے چہرہ کا رنگ ہر لحظہ متغیر ہو رہا تھا۔

اور ہاں، یہ تو بتاؤ یہ تمہاری کونسی بہن ہے جو آجکل بیمار ہے۔ میرے ہاں آنے پر تم نے مجھے بتایا تھا کہ تم بالکل تنہا رہتے ہو" میں نے اس کے راز معلوم کرنے کی نیت سے پوچھا۔

اس کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لئے چمک پیدا ہوگئی، مگر ساتھ ہی چہرے کا رنگ فق ہوگیا اور وہ بالکل ساکت ہوگیا۔

" ہوں! رو رہے کیوں ہو؟ ارے کیا ہوا تمہیں میں نے دیکھا اس کی آنکھوں سے دو موٹے موٹے آنسو نکل پڑے، وہ قریب آکر فرش پر بیٹھ گیا اور رازداری کے لہجے میں اس نے کہنا شروع کیا۔

رشید میاں آپ ٹھیک کہتے ہیں جب میں آپ کے پاس آیا تھا تو میں بالکل تنہا رہتا تھا اس وجہ سے کہ میرا اس دنیا میں کوئی رشتہ دار نہیں۔

میرا بچپن سے جوان ہونے تک کا زمانہ ڈپٹی مظہر علی کے ہاں گزرا ہے۔ ڈپٹی صاحب کا شمار شاہجہانپور کے بڑے لوگوں میں تھا۔ وہ بہت بڑی جائداد اور ایک خوبصورت بیوی کے مالک تھے، جوان اور خوبصورت بیوی! جو کئی بچوں کی ماں ہونے پر بھی جوان تھیں۔ ان کے چہرہ کی آب و تاب کو دیکھ کر میں سحرزدہ سا ہوکر رہ جاتا تھا۔

ہاں تو ڈپٹی صاحب کے ایک لڑکی تھی نام تھا "زرینہ" مگر لاڈ سے سب گھر والے اسے "جگو" کہکر پکارتے تھے "جگو" ان کے سب بچوں میں بڑی تھی، خوبصورت شرمیلی اور حساس ہم سن ہونے کی وجہ سے جگو مجھ سے بہت مانوس تھی اور میں بھی اس سے بہت محبت کرتا تھا۔

محبت! شاید نہیں، کیونکہ اس کا تو ہمیں شعور بھی نہ تھا کہ محبت کسے کہتے ہیں۔ لیکن اتنا یاد ہے کہ ڈپٹی صاحب کسی بات پر مجھے برا بھلا کہتے اور میں رنج و افسوس کی وجہ سے اس دن کھانا نہ کھاتا تو جگو منت کرکے مجھے کھانا کھلایا کرتی اور کہتی "میں ابا سے کہدوں گی۔ آئندہ تمہیں کچھ نہ کہیں گے۔"

اور ہاں یہ پان کھانے کی عادت بھی تو مجھے وہیں سے ہوئی۔ جگو میرے واسطے روز گلوریاں بناکر لایا کرتی تھی۔ میں جوانی کی منزل میں قدم رکھ رہا تھا۔ مجھے پہلی بار اس کا احساس اس روز ہوا جب کہ میں نے ڈپٹی صاحب کو اپنی بیگم سے یہ کہتے ہوئے سنا۔

"کیوں بی! آپ کو خبر بھی ہے؟ اپنی جگو اب جوان ہوگئی ہے نا۔ یہ اس کم بخت عزیز کے پاس کیوں بیٹھتی ہے۔ جوان لڑکی، جوان لڑکا اور پھر نوکر کوئی دیکھ لے تو کیا سمجھے میرے خیال میں اس چھوکرے کو اب رخصت کردینا چاہئے"

ڈپٹی صاحب کی بیگم۔ "ہاں! میں بھی تو کئی دفعہ سمجھا چکی ہوں۔ لیکن اس لڑکی پر ایک اثر نہیں ہوتا۔ عزیز کو رخصت کردینا ہی مناسب ہے۔"

اگلے روز جب میں اپنے ٹرنک میں اپنا مختصر سا سامان بند کررہا تھا تو جگو آگئی۔

"کہاں کی تیاری ہے "عزیز بھائی"؟" اس نے پوچھا

"جہاں خدا لیجائے" میں نے جواب دیا۔

آہ! اس کا دل دھک سے ہوکر رہ گیا، جیسے اسے کوئی بہت رنج دہ خبر سنا دی گئی ہو۔ اور شاید اس کے لئے اس سے زیادہ رنج دہ خبر اور ہو بھی نہ سکتی تھی کہ میں ان کے ہاں سے علیحدہ کردیا گیا ہوں۔ وہ مبہوت کھڑی مجھے دیکھ رہی تھی۔

"کیوں۔ کیا ابا جان نے جواب دے دیا۔؟" اس نے رندھی ہوئی آواز میں مجھ سے سوال کیا۔

"ہاں بی بی! انھوں نے بھی جواب دے دیا ہے۔ اور میں خود بھی یہاں سے جانا چاہتا ہوں"

"کیوں بھیا! تمہیں یہاں کیا تکلیف ہے۔؟ میں تمہیں نہ جانے دوں گی۔ معلوم نہیں ابا جان کو کیا ہو گیا ہے میں انہیں سمجھاؤں گی"

"نہیں جگو" مجھے اب جانا ہی چاہئے"۔ میں نے ڈپٹی صاحب کی ساری گفتگو اسے سنادی۔

"مجھے بھی ساتھ لے چلو بھیا! میں تمہارے بغیر کیسے رہ سکوں گی۔

"ایسی بات مت کہو جگو! میں تمہارے ہاں کا ملازم ہوں۔ تم میرے ساتھ کیسے رہ سکوگی، دنیا کیا کہے گی، زندہ رہا تو ملا کروں گا۔ بھول تو نہ جاؤ گی مجھے"

"اور آنسوؤں کے تبادلے کے ساتھ ہم نے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا —— کئی سال ہوئے میں نے سنا تھا کہ جگو کی شادی اودھ کے کسی تعلقدار سے ہوگئی ہے میں خوش تھا کہ میری پیاری جگو پر مسرت زندگی گزار رہی ہے لیکن آہ! میرا خیال غلط نکلا۔ کچھ عرصہ بعد تعلقدار صاحب نے دوسری شادی کرلی، ڈپٹی مظہر علی کا انتقال ہوگیا۔ ان کی بیوی اور دونوں لڑکے ان کے سامنے ہی مرچکے تھے اور اب ان کی اولاد میں غم نصیب جگو رہ گئی۔

میدان صاف دیکھا تو تعلقدار صاحب نے بھی رنگ بدلا۔ اپنی نئی بیوی کے ایما سے جگو کو اپنے پاس سے علیحدہ کردیا۔ اس کے لئے اپنے تعلقہ میں سے کچھ زمین اور تھوڑی سی

جائداد نفقہ کے لئے اور ایک مکان رہائش کے لئے دیدیا اور اب ——— جگنو عزیز کے ساتھ رہتی ہے۔ وہ عزیز کو بھائی اور عزیز اسے بہن سمجھتا ہے۔

اتنا سنانے کے بعد عزیز نے میری طرف کچھ عجیب نظر سے دیکھا جیسے کہ وہ کوئی خاص بات کہنی چاہتا ہو

کیوں رشید میاں! اگر آپ کی شادی جگنو بہن سے ہو جائے تو کیا بُرا ہے اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"بیوقوف، دور ہو میرے سامنے سے، سالا بدمعاش! میں نے اس کی طرف حقارت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ✽

✽ بدمعاش! نہیں، میں نے غلط کہا وہ بدمعاش ہرگز نہیں تھا۔ وہ شریف تھا۔ بلکہ شریف النفس اور ہاں "سالا" (بیوی کا بھائی) اُف میں نے کتنی سخت غلطی کی۔ کیا اس کے علاوہ کوئی اور گالی نہیں ہو سکتی تھی۔ میں سوچنے لگا۔

جیسے اس نے میرے دل کی بات پڑھ لی ہو

"تو پھر آپ کو بہنوئی کہنے میں کوئی ہرج نہیں"

اس نے قہقہہ لگا کر کہا اور اس کے بعد شرارت آمیز ہنسی کے ساتھ (وہ کھانے کے برتن اٹھا رہا تھا) کبھی کبھی جنسی فاقہ پرستی سے تنگ آکر میں جگنو سے شادی کر لینے کے مسئلے پر غور کیا کرتا ہوں لیکن جب یہ سوچتا ہوں کہ عزیز سے اُس وقت میرا کیا رشتہ ہوگا۔ تو یہ ارادہ ترک کرنا پڑتا ہے ———

ہم شریف لوگ!!

عباس جعفری

رباعیات

جناب مرزا غفران احمد صاحب نصرت قریشی

میں پھونک سے سورج کو بجھا سکتا ہوں
ٹھہرے ہوئے دریا کو بہا سکتا ہوں
لیکن یہ مجھے اے دوست منانے کیلئے
کیا بگڑے مقدر کو بنا سکتا ہوں

تصویر تری دل سے لگی ہے اب تک
کھیتی مری الفت کی ہری ہے اب تک
بیٹھا [illegible] سوچ کی قسم
افسردہ [illegible] ہوں میں [illegible] اب تک

(شیکسپیر کا شاہکار)

اتھیلو

قارئین کی سہولت کے واسطے اسمار متعلقہ اردو میں پیش کیے جاتے ہیں

بہرام	نواب وینس	ایک درباری
غیاث	بہرام کا بھائی	
لطیف	بہرام کا ایک رشتہ دار	
اطہر	ایک حبشی امیر	فوجی اعلیٰ افسر
یوسف	اطہر کا لفٹننٹ	
ابلیس	اطہر کا علمبردار	
راہب	وینس کا نوعمر رئیس	
مراد	سائپرس کا سابق گورنر	
کریم	اطہر کا ملازم	
زلیخا	بہرام کی بیٹی۔	اطہر کی بیوی
طاہرہ	ابلیس کی بیوی	
زہرہ	یوسف کی محبوبہ	

ایکٹ اوّل

سین اوّل وینس سائپرس کی بندرگاہ

راہب۔ اماجاؤ بھی۔ ان حیلہ سازیوں سے کیا فائدہ۔ تمہاری یہ باتیں ٹھیک نہیں۔ میں نے اپنی دولت کا تمہیں مختار بنا دیا۔ جیسے رجی چاہا تم نے اپنا سمجھ کر خرچ کیا۔ آج تم کس منہ سے یہ کہنے آئے ہو۔ کہ زلیخا کی شادی اس حبشی اطہر کے ساتھ ہو گئی۔ تم ضرور اس راز کو پہلے سے جانتے تھے۔

ابلیس۔ آپ اپنی کہے جاتے ہیں میری بھی سنئے۔ خدا کی قسم اگر مجھے اس معاملہ کی ذرا بھی خبر ہو تو مجھ سے جتنی چاہے نفرت کیجئے۔

راہب۔ تم تو مجھ سے کہتے تھے کہ میں اطہر کی صورت سے نفرت کرتا ہوں۔

ابلیس۔ جی ہاں! یہ تو میں اب بھی کہتا ہوں۔ اگر میں اس سے نفرت نہ کرتا ہوں تو آپ کو اختیار ہے، جتنا چاہے مجھے برا بھلا کہیں۔ کچھ دن ہوئے کہ: وینس کے تین مشہور رئیس اطہر کے پاس گئے۔ اور میری سفارش

کی کہ مجھے لفٹننٹ کی جگہ دیدیں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ میں کیا ہوں اور مجھے پورے طور پر یقین ہے کہ میں اس عہدے کا اہل ہوں۔ لیکن اس مغرور نے اپنی غرض کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک بلیغ گفتگو کے ساتھ۔ جیسی کہ ایک فوجی افسر کی زبان سے سنی جاسکتی ہے اُنکی التجا سے پہلو تہی کی اور۔ ان کی سفارش نہ مانتے ہوئے یہ صاف کہدیا کہ میں لفٹننٹ مقرر کرچکا۔ چنانچہ آپ جانتے ہیں وہ کون صاحب ہیں۔ وہی یوسف جو ایک حسینہ کے پیچھے جس سے اس کی شادی ہونے ہونے رہ گئی لٹ پھرتا ہے۔ ان کو اس عہدے سے کیا نسبت۔ وہ سیاسی معاملات میں تو ضرور ماہر ہے لیکن اوس کو نہ کبھی میدان جنگ میں لشکر کشی کرنے کا اتفاق ہوا نہ یہ جانتا ہے کہ فوجیں کس طرح صف آرا ہوتی ہیں ان معاملات سے وہ ایسا ہی ناواقف ہے جیسے ایک گھریلو عورت جو تمام دن چرخہ چلاتی رہتی ہے۔ ہاں یہ دوسری چیز ہے کہ جنگ کے متعلق کچھ کتابوں میں پڑھ پڑھا لیا ہو اور جس طرح سے کہ ایک پارلیمنٹ کے ممبر جنگی معاملات میں بحث کر لیتے ہیں وہ بھی بگھار سکے۔ مگر جنگی معاملات میں اس کی تمام قابلیت صرف زبانی جمع خرچ تک ہی محدود ہے تجربہ اسکو خاک نہیں۔ لیکن افسوس ایسا آدمی لفٹننٹ منتخب کر لیا جاوے اور اُس میں جس کی بہادری خود اطہر نے بارہا دیکھی ہے صرف ایک علمبردار ہوں روڈس سائپرس اور دیگر مقامات پر میں نے وہ وہ کارہائے نمایاں کئے ہیں۔ جو کبھی فراموش نہیں کئے جاسکتے اور اس محاسب سے ہر عیسائی بلکہ بت پرست بھی اچھا تھا۔ وہ جانتا کیا ہے سوائے اس کے کہ ہندوسوں کی جمع تفریق کرتا ہے

راہب:۔ اگر تمہاری جگہ میں ہوتا تو میں اس حبشی کی علم برداری کرنے کے بجائے اس کا گلا گھونٹ دیتا۔

ابلیس:۔ خیر اب کوئی چارہ نہیں۔ آجکل کی ملازمتوں میں سب سے زیادہ خرابی یہی ہے کہ تمام ترقیاں سفارش اور تعلقات پر مبنی ہیں کام کا کچھ لحاظ نہیں رکھا جاتا آپ خود فیصلہ کیجئے کہ آپ کا یہ کہنا کہ میں اطہر سے اچھے النیت رکھتا ہوں یا اُس کا رہین منت ہوں کہاں تک درست ہے۔

راہب:۔ میں تو کبھی اس کی ملازمت نہ پسند کرتا (بگڑ کر)

ابلیس:۔ ذرا صبر کیجئے میں نے اس کی ملازمت صرف اس غرض سے قبول کی ہے کہ ہم لوگ اس کے خلاف اپنی سازشیں چلاسکیں۔ ہم میں سے سب کے سب تو استاد ہونے سے رہے اور نہ تمام استاد اپنے شاگردوں اور معتقدوں سے وفاداری کی امید کرسکتے ہیں۔ آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ دنیا میں ایسے بہت سے کمینے خوشامدی لوگ ہیں جنھوں نے تمام عمر اپنے آقا کی خدمت میں اسطرح گذاردی جس طرح کہ گدھے پر جتنا چاہے بوجھ لاد دیجئے۔ جتنا چاہے اس کو زدوکوب کیجئے۔ شام کو دانہ گھاس ڈال کر ذرا چمکار دیا بس خوشی سے ڈھیچوں ڈھیچوں کرنے لگا۔ مگر جو ضعیفی آنے تو ضعیف کو کون پالتا ہے۔ نکال باہر کیا۔ اس قسم کے وفادار لوگ مستحق نفرت ہیں۔ ان کی ہنٹروں سے کھال اڑادی جائے۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اپنی چال ڈھال لب ولہجہ سے ایسے معلوم ہوتے ہیں کہ دنیا میں ان سے بڑھ کر کوئی وفادار نہیں۔ لیکن ان کی فطرت ذاتی مفاد سے سرمو انحراف نہیں کرتی۔ اور اپنی غلامی اور وفاداری کی آڑ میں اپنا اُلو سیدھا کرتے ہیں۔ اور جب ان کی جیب گرم ہوجاتی ہے تو خود آقا بن جاتے ہیں اور درحقیقت ایسے ہی لوگ کچھ اسپرٹ رکھتے ہیں ایجانب کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہے۔ لیکن آپ یقین جانئے کہ اگر خدا مجھے آقا بنادے۔ تو پھر میرا رویہ دوسرا ہوگا۔ اس حبشی کی خدمت کرنے میں میرا ذاتی فائدہ پرورش پارہا ہے۔ خدا گواہ ہے میں اس کی ملازمت کسی محبت کے جذبہ سے نہیں کر رہا ہوں۔ بلکہ اس ظاہرداری سے میرا ایک خاص مقصد ہے اور میں آپ کو بتادینا چاہتا ہوں۔ کہ جس دن میرے ظاہری عادات واطوار میرے باطنی جذبات کی ترجمانی ہونے لگے، اُس دن ایک بیوقوف سے

بیوقوف انسان بھی میرے دل کی بات بتا دیگا۔ میں ظاہر میں کچھ اور ہوں۔ اور باطن میں کچھ اور
راہب :۔ اطہر! کس قدر خوش نصیب ہوگا۔ اگر زلیخا کی شادی اسکے ساتھ اسقدر آسانی سے بغیر کسی مخالفت کے ہوگئی
ابلیس :۔ اچھا۔ میں ترکیب بتاتا ہوں۔ جاؤ۔ اور زلیخا کے والد کو اس معاملہ کی خبر دو۔ اس کو خواب سے بیدار کرو۔
تاکہ وہ اطہر کا پیچھا کرے۔ اور اس کو مجرم قرار دے۔ اس طرح اطہر کا سارا عیش منغض ہوجاویگا۔ اور زلیخا کے والد سے عام
تعلقات منقطع ہوجائیں گے۔ اگرچہ اطہر اس وقت عیش و عشرت کے نشہ میں مست ہے مگر جس قدر ممکن ہوسکے اس کو
پریشان کرو اور اس کے رنگ میں بھنگ ملادو یہ مانا کہ اس وقت اطہر کی قسمت زور پر ہے اور زمانہ بھی اس کی موافقت
کر رہا ہے لیکن ہم تم بھی وہ کام کریں۔ جس سے اس کی ساری خوشی خاک میں ملجائے۔
راہب :۔ اس کے باپ کا گھر تو یہ سامنے ہی ہے میں اُسے زور سے آواز دیتا ہوں۔
ابلیس :۔ ہاں ضرور مگر ایسے لہجے میں۔ اور۔ ایک گھبرائی ہوئی آواز میں۔ کہ لوگ سمجھیں کہ واقعی کہیں شہر میں آگ لگ گئی۔
راہب :۔ گھبرائی ہوئی آواز میں۔ بہرام! بہرام! بہرام!
بہرام اُٹھئے اُٹھئے۔ آپ کے گھر میں چور۔ اپنے مال و اسباب سے خبردار۔ گھر والوں سے ہوشیار
دیکھنا آپ کی لڑکی تو گھر میں ہے۔ ارے چور چور۔ (بہرام کھڑکی میں سے دیکھتا ہے۔)
بہرام :۔ سارے کیوں اسقدر چیخ رہے ہو۔ خیر یت ہے
راہب :۔ ذرا دیکھئے۔ آپ کے گھر والے تو سب موجود ہیں
ابلیس :۔ ذرا اپنا دروازہ تو دیکھئے۔ اچھی طرح تو بند ہے۔
بہرام :۔ ان سوالات سے تمہارا کیا مطلب ہے ؟
ابلیس :۔ خدا کی قسم۔ آپ کا گھر اجڑ گیا۔ خدا کیلئے آپ اپنے کپڑے پہن کر باہر آئے آپکا دل ٹکڑے ٹکڑے پاش پاش ہوجائیگا
آپکی لڑکی کا گھر اُڑ گیا۔ اور وہ اس حبشی کے ہمراہ ہے۔ اُٹھئے اور شہر کو خطرے کی گھنٹی بجاکر بیدار کر دیجئے ورنہ
شیطان اطہر اس سے شادی کرے گا۔ اُٹھئے اُٹھئے
بہرام :۔ کیا تم سب پاگل تو نہیں ہوگئے۔
راہب :۔ جناب آپنے میری آواز بھی پہچانی
بہرام :۔ نہیں۔ فرمائیے۔ فرمائیے آپ کون بزرگ ہیں
راہب :۔ مجھے راہب کہتے ہیں۔
بہرام :۔ اگر تم ہی راہب ہو تو چلے جاؤ یہاں سے میں تم سے کہہ چکا ہوں۔ کہ میرے گھر کا طواف نہ کیا کرو۔ میں نے
تم سے صاف صاف کہدیا کہ میری لڑکی تمہارے واسطے نہیں ہے۔ اس وقت کتے کی طرح سے پیٹ بھر کے شراب
کے نشہ میں وحشت شرارت کرنے نکل کھڑے ہوئے۔ میری نیند حرام کر دی۔
راہب :۔ ذرا ٹھہرا کئے ہوئے۔ جی جی
بہرام :۔ شاید تم میرے غیظ و غضب اور مرتبہ سے آگاہ نہیں تمہیں یہ معلوم نہیں کہ میں اس گستاخی کا
تمہیں کیا جواب دے سکتا ہوں۔
راہب :۔ جناب ذرا صبر تو کیجئے
بہرام :۔ تم یہ چوری چوری کیا کہہ رہے ہو۔ تمہیں معلوم ہے کہ میں ایک گنجان شہر میں رہ رہا ہوں۔ کوئی سنسان

تو نہیں جہاں چوری کا امکان ہو سکتا ہے

راہب۔ جناب من میں آپ کے پاس کوئی برا خیال لیکر نہیں آیا ہوں

ابلیس۔ خدا کی قسم آپ انہی لوگوں میں سے ہیں کہ جن سے اگر شیطان کہے۔ کہ خدا کی عبادت کرنا انسان کا فرض ہے تو وہ خدا کی عبادت چھوڑ دیں۔ صرف اس وجہ سے کہ شیطان جس سے وہ نفرت کرتے ہیں۔ انکو مشورہ دے رہا ہے ہم لوگ جنکو آپ مکار تصور کرتے ہیں۔ آپ کو آپ کی لڑکی کی بابت خبر دے رہے ہیں اور آپ اس کو اس حبشی سے بچانے کے لئے انکار کر رہے ہیں۔

بہرام آپ، کون بزرگ ہیں جو اس قدر درشت لہجے میں گفتگو کر رہے ہیں.

ابلیس جناب میں ہوں جو یہ خبر لیکر آیا ہوں کہ آپ کی لڑکی جو اس حبشی کیساتھ بھاگ گئی۔

بہرام تو ــــ بدمعاش۔

ابلیس جی جی آپ۔ امیرو نیس

بہرام تجھے اس گستاخی کا کفارہ دینا ہوگا۔ راہب میں تجھے خوب جانتا ہوں

راہب میں آپ کی ہر بات کا جواب دینے کو تیار ہوں۔ لیکن میری ذرا سی التجا ہے۔ وہ سن لیجئے اگر یہ کام آپکے مشورے سے ہوا ہے جیسا کہ میرا خیال ہے کہ آپکی شریف لڑکی اسوقت آدھی رات پچھلے پہر اس نفس پرست حبشی کی نازیبا آغوش میں تنہا چلی جاوے سوائے اس کے کہ ایک معمولی نوکر ہمراہ ہو۔ اور اگر اس واقعہ کا آپ کو علم ہو۔ جب تو بیشک، ہم نے آپ کے ساتھ بڑی گستاخی کی۔ اور اگر اس واقعہ کا آپکو علم نہ ہو تو میری عقل سلیم گواہی دیتی ہے کہ جناب ہمیں سخت و سست کہکر غلطی پر ہیں۔ آپ یہ خیال نہ فرمائیے کہ میں صرف ایک معمولی سی بات کی خاطر آپ کی نیند میں اس گستاخی سے مخل انداز ہوا ہوں میں پھر عرض کرتا ہوں کہ آپ کی صاحبزادی نے اپنی فطرت کے خلاف آپ کے ساتھ بڑی سخت بیوفائی اور نافرمانی کی ہے کہ اپنے حسن و جمال۔ ہوش و خرد اور قسمت کو ایک ایسے خانہ بدوش گمراہ حبشی کے ہاتھ بیع کر دیا ہے کہ جس کا کوئی اعتبار اور ٹھکانہ نہیں (بشرطیکہ آپکی رائے شامل حال نہ ہو) جائیے اور اندر جاکر دیکھئے اگر آپ زلیخا کو اپنے بستر پر پائیں تو ہم لوگوں کو اس دھوکہ دہی پر حکومت کے ہاتھوں سخت سے سخت سزا دلوانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کریں۔

بہرام۔ (نوکروں سے) شمع روشن کرو مجھے ایک مشعل لاکر دو۔ سب کو اٹھا دو یہ واقعہ اس خواب کی تعبیر معلوم ہوتا ہے۔ جو میں ابھی دیکھ رہا تھا۔ میرا دل گواہی دیتا ہے میرا خواب سچ ہوگا۔ ارے مشعل لاؤ۔ جلدی لاؤ۔ (اندر جاتا ہے)

ابلیس اچھا راہب خدا حافظ۔ مجھے اب یہاں سے چلا جانا چاہیے۔ میں ایک سرکاری ملازم ہوں۔ میری پوزیشن اس وقت ایسی نہیں کہ میں اطہر کے خلاف گواہی دوں اور اگر میں ٹھہرتا ہوں تو ایسا ضرور ہوگا۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ حکومت اس بارے میں اطہر کو خواہ کتنی ہی سخت سست کہلے مگر وہ اس میں بہتری سمجھے گی کہ اس کو برخاست نہ کرے۔ کیونکہ سائپرس کی جنگ شروع ہو گئی ہے اور اطہر کے سپرد بہت اہم کام ہیں حکومت کو اطہر جیسا نڈر کسی قیمت پر سردست نہیں مل سکتا۔ جو جنگ کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے سکے۔ اگرچہ میں اس سے نفرت کرتا ہوں جیسے نار جہنم سے مگر مصلحت وقت یہی ہے کہ میں اظہار دوستی کرتا رہوں۔ گو یہ ایک بناوٹی شے ہوگی تم جاؤ اور ان لوگوں کی رہنمائی کرو تاکہ تمہیں بھی یقین ہو جائے کہ یہ لوگ اطہر کے خیمے تک پہنچ گئے میں بھی تمہیں وہیں ملوں گا۔ اچھا خدا حافظ۔ (چلا جاتا ہے۔)

بہرام معہ چند نوکروں کے مشعل لئے آتا ہے۔ بہرام۔ افسوس یہ ایسی آفت ناگہانی ہے جسکا مجھے کبھی گمان بھی نہ تھا۔ وہ ضرور بھاگ گئی ہے ارے میں لٹ گیا۔ میری دنیا اندھیر ہوگئی۔ میری زندگی حرام ہو گئی۔ راہب یہ تو بتاؤ۔ تمنے اس کو کہاں دیکھا۔ اور بدنصیب لڑکی تو کس کے ساتھ فرار ہوگئی۔ ایک حبشی کے ساتھ۔ دنیا میں کوئی ایسا کمبخت باپ ہوگا جس کی لڑکی اسطرح فرار ہوجائے۔ راہب تم نے کیسے جانا کہ وہ میری لڑکی تھی۔ اُف! اُسنے مجھے ایسی دغا دی جسکا مجھے خواب وخیال ہی نہ تھا وہ تمسے بھی کچھ کہتی تھی؟ ارے اور مشعلیں لاؤ میرے تمام کنبہ داروں کو جگا دو۔ راہب کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ ان دونوں کی شادی ہو چکی ہوگی؟

راہب جی ہاں حضور مجھے تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔

بہرام۔ اُف۔ یہ کیا کہا۔ وہ چپکے سے نکل کیسے گئی۔ میری اولاد۔ میرا گوشت۔ میرا پوست۔ تری فطرت میں یہ دغا بازی میں دنیا کو نصیحت کرتا ہوں کہ آئندہ وہ اپنی بھولی بھالی بیٹیوں سے خبردار رہیں۔ وہ کہتی کچھ اور ہیں کرتی کچھ اور انکے ظاہری افعال انکے خیالات کے حامل نہیں ہوتے راہب کیا دنیا میں ایسا بھی جادو ہے جو دوشیزہ لڑکیوں کی عقل پر پردہ ڈالدے۔ کیا تمنے کہیں ایسا سنا ہے۔

راہب۔ جی ہاں میں نے پڑھا تو ہے۔

بہرام۔ اچھا میرے بھائی کو اٹھادو آہ۔ اس سے تو میں راہب ہی کے ساتھ اسکی شادی کردیتا۔ کچھ لوگوں کو اسطرف سے روانہ کرو اور چند کو دوسری طرف۔ راہب! تم بتاؤ ہم اس کو کہاں گرفتار کرسکیں گے۔

راہب۔ مجھے اُمید ہے کہ میں ضرور اس کو تلاش کرلوں گا۔ بشرطیکہ آپ مجھے کافی کمک دیں اور میرے ہمراہ چلیں۔

بہرام اچھا چلو میں ہر گھر سے مدد کے لئے آدمی لیتا چلوں گا۔ میرا اثر شہر والوں پر جو ہے تم جانتے ہی ہو (نوکروں سے) میرے ہتھیار لاؤ۔ ان افسروں کو جو اس وقت کار خاص پر ہوں بلا لاؤ۔ راہب تمہارا خدا بھلا کرے تم بڑے شریف آدمی ہو۔ ہمارے آگے چلو چلو میں تمہاری خدمات کا خاطر خواہ صلہ دوں گا۔

(باقی آیندہ) منتقم بی۔اے

مشاعرہ ادارۂ حیدری

بر دولت کدہ جناب محمد زبیر خاں صاحب زبیرؔ ٹونکی

مصرع طرح۔ لہو کا قطرہ قطرہ ہو گیا جب جذب پیکاں میں

خیام الہند حضرت حیدرؔ دہلوی مدظلہٗ

نہ دیکھو چشم نفرت سے مجھے حال پریشاں میں ۔ مشیت کا تبسم کھیلتا ہے میرے داماں میں
لہو کا قطرہ قطرہ ہو گیا جب جذب پیکاں میں ۔ تجلی کروٹیں لینے لگی آخر رگِ جاں میں
بالآخر پھوٹ نکلیں سب گلِ آتش بکف ہو کر ۔ چھپا دی تھیں کسی نے بجلیاں خارِ گلستاں میں
بجز آوارگی میری منزلِ مقصد نہ پہنچائے ۔ کوئی ایسی ہی گردش ہو الٰہی چرخِ گرداں میں
ابھی نیچی نگاہیں کی تھیں مجبور سجدوں پر ۔ یہیں سے پہلے ضد پیدا ہوئی تھی کفر و ایماں میں
دلِ برباد کی کیفیتیں برباد کیوں ہوتیں ۔ تڑپ بجلی میں ہے تابندگی مہرِ درخشاں میں
گریباں چاک گل نکہت پریشاں نالاں بلبل ۔ پراگندہ طبیعت آجکل سب ہیں گلستاں میں
ادائیں وہ تری دلکش کہ بس دیکھا کرے کوئی ۔ نگاہیں وہ خلش آگیں کہ رکھ لیجیے رگِ جاں میں
ازل میں اس سراپا حسن کو بے پردہ دیکھا تھا ۔ ابھی تک بجلیاں سی کوندتی ہیں قلب حیراں میں
کبھی انجام دیکھ کر چمن میں فرطِ عشرت کا ۔ ذرا گل مسکرائے اور منہ ڈالا گریباں میں
یہ ہنگام سحر کس نے وفا کا نغمہ چھیڑا تھا ۔ کہ جتنے گل ہیں سب جامے سے باہر ہیں گلستاں میں
یہ وحشت کا تقاضا ہے چلو سر پر اتار آئیں ۔ طبیعت ہی تو ہے شاید بہل جائے بیاباں میں

نہ زعمِ شاعری حیدرؔ نہ اندازِ بیاں آیا
کہ میں یک ایک کا منہ دیکھا کیا بزمِ سخنداں میں

(مسیح الملک حکیم حضرت کیفؔ دہلوی)

غضب کی سوزشِ وحشت ہے برپا قلبِ مضطر میں ۔ الٰہی آگ لگ جائے بہارِ گل بداماں میں
تصور ہے نہ کوئی اشک میری چشم حیراں میں ۔ بس اک آئینہ تصویر ہے اب بزمِ امکاں میں
فقط ترتیبِ آب و گل کی ہے ہستی کے ساماں میں ۔ خرابی کے سوا رکھا ہی کیا ہے نوعِ انساں میں
یہ مانا لطفِ سجدہ بھی معلوم ہوتی ہے ۔ مگر یہ اتحاد اچھا نہیں ہے کفر و ایماں میں
تمہارا حسن رنگیں دل پہ نقش کا تجھو ۔ تم اب پہلو بدل سکتے نہیں آغوشِ پیکاں میں
تمہیں بیمار ہو جس کی مسیحائی کا ہم بیمار ہیں ۔ تمہیں نے چٹکیاں لی تھیں مرے خوابِ پریشاں میں
بلا آنے ہی اچھا گل کھلایا دستِ وحشت نے ۔ نظر آنے لگیں کلیاں ہی کلیاں میرے داماں میں

یہ کیوں دورانِ خوں کیساتھ شعلے سے نکلتے ہیں ۔ یہ کس نے بجلیاں بھر دیں مری رگ رگ میں جاں میں
تمہارے حسن لامحدود سے جنکو تعلق ہے ۔ وہ سب جلوے سمٹ آئے ہیں میری چشمِ حیراں میں
یہی نکلا نتیجہ گریۂ بے اختیاری سے ۔ وجودِ صبحِ محشر تھا نہاں شمعِ شبستاں میں
ہر ساعت لیے پھرتی ہیں آنکھوں شوخیاں انکی ۔ رگِ جاں سے کبھی دل سے کبھی ہے نہاں رگ جاں میں
جنابِ کیفؔ چشمِ ساقیِ مہوش کا کیا کہنا ۔ نہ وہ ساغر میں گردش ہے نہ وہ گردش ہے دوراں میں

(جناب ماسٹر زاہرؔ ساکھنوی)

ادھر افشاں ہے زلفوں میں ادھر صورت ہے جاناں کی ۔ قیامت تک نہ سمجھیں گی تمیز اب کفر و ایماں میں
کسی پر کیا ہی ہوگی سوادِ شامِ ہجراں میں ۔ نہ دیکھا ڈال کر منہ صبح نے اپنے گریباں میں
ہوا ایسا انقلاب ان کے جنونِ حشر ساماں میں ۔ رگِ جاں کا کھنچ آئے سب لہو تارِ گریباں میں
میں کیسے مان لوں دورانِ خوں سے ہے خلش پیدا ۔ یقیناً دوڑتی پھرتی ہے اک بجلی رگِ جاں میں
لے خود رفتۂ الفت نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے ۔ یہ پیکاں دل میں نہاں ہے کہ دل نہاں ہے پیکاں میں
معاذ اللہ یہ دستِ جنوں کی کشمکش پیہم ۔ ابھی قاتل کے دامن پر ابھی میرے گریباں میں
وفا پر حرف آتا تھا رہائی سخت مشکل تھی ۔ مری آہوں نے روزن کر دیے دیوارِ زنداں میں
یہ منظر خون کے آنسو رلائیگا ہمیں کب تک ۔ کہ قطرے زخم پنہاں پر تری تیغِ نگہ میں
کیا چاک اپنی کج فہمی کا پردہ خود زلیخا نے ۔ حقیقت چھپ رہی تھی حضرتِ یوسف کے داماں میں
فرشتے عرش سے آئیں قدم لینے کو اے زاہرؔ ۔ اگر اک شائبہ انسانیت کا پائیں انساں میں

جناب منتظمؔ بی اے سنبھلی

یہ کیسے آج تاروں سحر ہیں شامِ ہجراں میں ۔ کہیں رخنہ پڑا شاید نقابِ روئے جاناں میں
خیالِ زلف سے گھبرا کے یادِ اس رخ کو کرتا ہوں ۔ یہ ہے وہ کفر جس سے بچ گئی آئی ہے ایماں میں
دلِ افسردہ خاطر کا بگڑنا ہی سنورنا ہے ۔ طبیعت مطمئن پاتا ہوں زلفِ پریشاں میں
سرِ بزمِ بتاں موتی بکھیرے پھول برسائے ۔ عجب طراریاں ہیں دیدۂ خوں نابہ افشاں میں
تمہاری یاد کیا آتی ہے گویا موت آتی ہے ۔ تمہارے نام سے اٹھتے ہیں شعلے قلبِ سوزاں میں
کہاں ہے شعلہ سامانی کہاں ہیں شوخیاں انکی ۔ وہ کیوں حیراں نظر آتے ہیں میری چشم حیراں میں

نہ کیوں اے ستم جاری رکھیں ہم سعیِ آزادی   کہ پہنچایا ہے ہم کو شوقِ آزادی نے زنداں میں

(جناب محمد زبیر رضا صاحب زبیرؔ - ٹونکی)

وہ گلشن ہیں کیا کیا داغ میرے قلبِ ویراں میں   عجب گلہائے رنگا رنگ کھلتے ہوئے ہیں ہیں
دلا بیتاب سے خیالِ روئے جاناں میں   عیاں کچھ صبح کے آثار بھی ہیں شامِ ہجراں میں
تمہیں عشق و وفا کی قدر ہی معلوم کیوں ہوتی   کبھی آئے ہی تم اہلِ نظر کی بزمِ امکاں میں
جنوں نے جامۂ ہستی بھی میرا چاک کر ڈالا   رگیں تن میں نہیں یہ تار ہیں میرے گریباں میں
نہ دل ہی ہے امنگیں ہیں نہ دل دیسا وہ تمنا ہے   کہ زندہ ہوں میں شامِ غم مگر مرنے کے ارماں ہیں
یہ ہے حشر تک قاتل شہادت قتل کی دینگے   کہ معصوموں کا قتل ہوتا نہیں ہے جذبِ پنہاں ہیں
تصدق میری آنکھوں کے تصور پر مری نظریں   کہ جب میں دیکھتا ہوں خود کو پاتا ہوں ترے داماں میں
غمِ جاناں - غمِ فرقت - غمِ دنیا - غمِ عقبیٰ   کہاں سے آ گئی گنجائش اتنی قلبِ انساں میں
تمیزِ کفر و عرفاں خدا کا تذکرہ کیسا   ابھی الجھا ہوا ہوں میں زبیرؔ اپنے ہی عرفاں میں

جناب آفتاب احمد صاحب افقؔ دہلوی

وہی وحشت ہے پھر سوزش وہی ہے قلبِ سوزاں میں   بہار انگڑائیاں لیتی ہوئی آئی گلستاں میں
کہاں تک مجھ سے چھپتے میری نظروں سے نہاں رہتے   تصور نے تمہیں بھی لا بٹھایا بزمِ امکاں میں
سرِ خوئے عارض ہی ہیں دلِ کا کاکل ہی   جسے تمیز ہوگی اس کو ہوگی کفر و ایماں میں
ترے کوچے سے لیکر تو چلا ہے جوش وحشت کا   ترے وحشی کا تلوا اک نہیں سکتا بیاباں میں
یقیناً موسمِ گل کار زمانہ رو بہ رخصت ہے   الجھ کر رہ گیا کیوں دستِ وحشت چاکِ داماں میں
شکستہ دل انتظار بیکل ہوئی تلووں میں چھالے ہیں   الٰہی خیریت کے ساتھ پہنچائے بیاباں میں
خدا نے داغِ دل کو میرے وہ تابندگی دی ہے   افقؔ خورشید میں تابش نہ ایسی ماہِ تاباں میں

جناب سجادؔ بریلوی

بہر انداز ہو شانِ خدا گلہائے خنداں میں   صحیفے سینکڑوں نظروں سے گذرے ہیں گلستاں میں
اثر اتنا تو پیدا ہو ہماری آہِ سوزاں میں   کسی دن آگ لگ جائے الٰہی شامِ ہجراں میں
دلا الجھا تھا تو الجھا تھا نگاہیں بھی الجھتی ہیں   کسی دن ہم بھی الجھیگا خیالِ زلفِ جاناں میں
رہیگا تا کجے دامن کشاں تو ہم سے اے ظالم   ہمارا ہاتھ ہوگا ایک دن تیرے گریباں میں
کھنچے جاتے ہیں چشم و دل کیسو رت نہیں رکھے   غضب کی جاذبیت ہے نگاہِ برق ساماں میں
مری جامہ دری کیا ہے الٰہی اک تماشا ہے   بگولے ناچتے ہیں میری وحشت پر بیاباں میں
وہی سجاد اپنا ہے جو اپنے کام آ جائے   مگر کب کام آتا ہے کوئی حالِ پریشاں میں

جناب فضل الرحمن صاحب ضیاؔ رہبر (ریتا نگڈھی)

نہ مے ساغر بکف ساقی نہ شامل بزمِ رنداں میں   صلاحیت نہیں کیا ہے کی مجھ سرور گریباں میں
غضب کی آب تھی سفاک تیری تیغِ براں میں   مرا بھی خون شامل ہو گیا خونِ شہیداں میں
بہت سی آمدنیں لیکے اپنے دل میں آیا تھا   مگر پرسش کہاں اہلِ وفا کی بزمِ جاناں میں

نہ جانے کونسی لغزش ہوئی مجھ آبلہ پا سے   یکایک نوک کی لینے لگے کانٹے بیاباں میں
کرے گا کیا کچھ نہ خاکِ مجنوں میری وحشت پر   کہ میں نے مدتوں تنکے چنے ہیں کوئے جاناں میں
کبھی جنبانیِ عاشق کا کچھ احساس بھی ہوگا   رہے گی سادگی کب تک تمہارے حسنِ پنہاں میں
حسینانِ جہاں تم نے ابھی دیکھے نہیں رہبرؔ   ہزاروں مکر پوشیدہ ہیں انکے عہد و پیماں میں

جناب محضرؔ (ریتا نگڈھی)

نہیں دیکھا تھا ہنگامِ سحر میں نے گلستاں میں   بنا ہیں یہ سبب تیرے تم گلوں کے چاک داماں میں
گوارا ہو نہیں سکتی ادائے گل گریباں میں   جنوں نے پرورش پائی ہے آغوشِ بیاباں میں
مجھے انساں بنا کر کر دیا آلودۂ عصیاں میں   تفاوت اس قدر ہستی میں اور ہستی کے عنواں میں
نہیں ہے یہ سببِ تبسم ان کے ہونٹوں پر   چھپا کر دل لئے جاتے ہیں تیوری کے داماں میں
قدمِ ناز کو کیوں زحمتِ گلگشت دی تم نے   وہ چیزیں ہم کو مل جاتیں سرِ جیب و گریباں سے
خیالِ زلف میں دل غرق دل میں لطفِ طلعت   الٰہی اس قدر گہرا تعلق کفر و ایماں میں
انہیں تاثیرِ گرم و سردِ الفت کچھ نہیں معلوم   وہ چشمِ تر سے آنکھ کر گئے کیوں قلبِ سوزاں میں
مجھے تم مہلتِ فریاد دو تو سوچ کر دینا   تمہارا راز بھی پنہاں ہے میرے رازِ پنہاں میں
تمہیں انگڑائیاں لیتے ہوئے مجھ کو نظر آئے   فلک کے چاند تاروں میں گلوں کے چاک داماں میں
کوئی مجروحِ تیغِ ناز کوئی جاں بلب محضرؔ   کہ مقتل کا سا ہنگامہ ہے برپا بزمِ جاناں میں

جناب آر مورس سنگھ عارفؔ (لدھیانوی)

خدا پوشیدہ انسانوں میں ہے یا بزمِ انساں میں   مگر عارف تجھے ہے جستجو اس کی بیاباں میں
کبھی شوقِ نمایاں میں کبھی جذباتِ پنہاں میں   شرارت رو نہ دیکھا ہے تمہیں کو بزمِ امکاں میں
چمن کا غنچہ غنچہ اک بہارِ جاودانی ہے   اگر صیاد کا کھٹکا نہ ہو صحنِ گلستاں میں
سرِ منزل پہنچ کر بھی اگر کچھ دور ہے منزل   سمندِ عمر کو ٹھکرا رہا ہوں سعیِ جولاں میں
کبھی تو جلوۂ امید سے کم تیرہ بختی ہو   الٰہی جوڑ دے ٹکرا سحر کا شامِ ہجراں میں
جہاں اندھیر ہے تاریک دل ہے تیرہ قسمت ہے   الجھ کر رہ گئیں نظریں یہ کس کی زلفِ پیچاں میں
تصدق رخ پہ دل اپنا کیا زلفوں پہ دل ہی   نہیں ہے کیا کچھ فرق ہم نے کفر و ایماں میں
مجھے اس شوخ نے دیکھا کچھ ایسی مست نظروں سے   امنگیں کروٹیں لینے لگیں خوابیدہ ارماں میں
تری موجودگی میں قلبِ سوزاں گل بداماں تھا   جگر اب کیا ہے اب خاک اڑتی ہے قلبِ سوزاں میں
نہ زنجیروں میں جھنکاریں نہ لب تک آہ آنے دی   ہمیں نے یہ قیامت کی کڑی جھیلی ہے زنداں میں
بتوں سے رخ سے شانِ حق کبھی پیدا نہیں عارفؔ   ابھی اک امتیازی فاصلہ ہے کفر و ایماں میں

جناب محمد شریف صاحب اشرفؔ

نظر آتے ہیں اب جلوے ہی جلوے مجھ کو آنکھوں میں   نگاہِ شوق جا پہنچی حریمِ حسنِ جاناں میں
ازل کے دن سے شاید ربط ہے کفر و ایماں کا   کہ ہے روئے منور سایۂ زلفِ پریشاں میں
وہی کانٹے الجھتے ہیں مری قبا کے داماں میں   کہ جن کو پرورش میں نے کیا خونِ رگِ جاں میں

نہ مجبور کشتی امید گرداب حوادث سے
تأمل کر ذرا سی دیر ہے الطاف یزداں میں

یہ خود ناپید ہے لیکن معمااس سے پیدا ہیں
نہیں معلوم کیا کیا راز ہیں تخلیق انساں میں

کیسے محسوس ہوتی ہیں فضائیں نفس بیکس کی
مقید قوت حس ہی اسیروں کی ہے زنداں میں

ابھی کیسی امید کامیابی اور ناکامی
وہ بچنا شرط ہے پہلے حدود کوئے جاناں میں

حالت میں بھی شعر اچھے نکلتے ہیں کہیں اشرفؔ
کہاں فکر سخن ہوتی ہے افکار پریشاں میں

جناب عبدالرشید خاں صاحب راشد (دہلوی)

نہیں آنسو نہ سمجھو ہمنشیں ہجر جاناں میں
مجھے ٹکڑے کلیجے کے نظر آتے ہیں داماں میں

نہ ہرجا و تجھ میں نہ گلہائے گلستاں میں
تجلی ہے اگر انکی تو میرے قلب سوزاں میں

نہایت مطمئن ہے دل خیال روئے جاناں میں
سمٹ کر آگئی جنت کی راحت میرے داماں میں

میں وہ گردش کا مارا ہوں میں وہ تیرہ مقدر ہوں
گذر جاتی ہے ساری رات طوف کوئے جاناں میں

زمیں برہم زماں برہم نظام جزو کل برہم
قیامت ڈھا گئے تم اک نگاہ برق ساماں میں

عجب ہیج و پیچ سے ہنستے بولتے نکلے ہیں دیوانے
یہ گلشن میں بہار آئی کہ عید آئی بیاباں میں

ہجوم اہل نظر کا کب نہیں تیجا لنے کے در پر
بلا کا جذب ہے تہہ جلوں کے حسن تاباں میں

جناب عبدالرشید صاحب شیدا (گجراتی)

کہیں ہے رنگ لالہ میں کہیں نسرین و ریحاں میں
مزا دیتے ہیں کیا کیا داغ میرے قلب سوزاں میں

بہار آئی ہوا محشر بپا خوابیدہ ارماں میں
یہ کون انگڑائیاں لینے لگا جذبات پنہاں میں

ترا در چھوڑ کر جاؤں میں کیوں صحن گلستاں میں
کہ غلطیدہ ہیں لاکھوں جنتیں اک لطف پنہاں میں

تری کیا بیکسی ہو کر امید دید کیا لے گی
ابھی کچھ روز رہنے دے مجھے حال پریشاں میں

خدا ہی ہے جو بیڑا پار ہو تیری محبت کا
مرے ناخدا میں گھر گیا ہوں سخت طوفاں میں

چمکتے ہیں وہی تو چاند تاروں کے گردوں پر
جو گرتے ہیں کسی آنکھوں سے آنسو شام ہجراں میں

مرا آغاز ہی انجام زا معلوم ہوتا ہے
نظر آثار آتے ہیں نہیں کہ آپ کی ہاں میں

شرف بخشا ہے یا دو خاک کو اک جذبہ صادق نے
سمائی ہے محبت روح بن کر جسم انساں میں

کہاں شیدا جنون شوق مجھ کو آج لے آیا؟
کہ محو دید خود کو پا رہا ہوں بزم جاناں میں

جناب خوشنما (دہلوی)

یقیناً خون دشمن کا تھا انکی نوک خنجر کا نہیں
کہ شاید موت کی محسوس ہوتی جاں میں کرتا رگ

مرے دست جنوں کی ہوشیاری کو کوئی دیکھے
کہ پیدا ہو گئے لاکھوں گریباں اک گریباں میں

دیا ہے شوق نظارہ نے مجھ کو عنایت ہو
نظر ہی وہ جو تم کو دیکھے گلہائے خنداں میں

وہی برقی وہی جنبش وہی افسردگی طاری
دل بلبل کے ٹکڑے ہیں کہ یہ گل ہیں گلستاں میں

شب غم تیری مشکل ہے کہ کس کی گلشن دیکھاں
نہ دل ہے میرے قابو میں تم ہو تیرے امکاں میں

ہزاروں ساز و ساماں خوشنما کے ہو گئے غارت
تمہاری چھوٹی باتوں میں تمہاری سیج پیماں میں

جناب حکیم غافر صاحب لکھنوی

ترے جلوے مقید ہیں طلسم چشم حیراں میں
کہ آویزاں ہیں تصویریں تری دیوار مژگاں میں

دل مجروح پر میں رو رہا ہوں خون کے آنسو
قیامت خیز ہنگامے چھپے بیٹھے ہیں پیکاں میں

مجھے حیرانئ نظارہ ہرگز نے نہیں دیتی
نظر آتا ہے وہ عالم نگاہ برق ساماں میں

ہمارے دل کی زخموں کی غمخواری ہو کیونکر
نمک کا کوئی ذرہ اب نہیں باقی نمکداں میں

تبسم زیر وہ کافر حسین کیا سامنے آیا
سمائی جا رہی ہیں بجلیاں سی چشم حیراں میں

تماشائے طلسم زندگی پر کیوں نہ حیرت ہو
بہت و چسپیاں پنہاں ہیں اس خواب پریشاں میں

بساط قلب مضطر اک لہو کی بوند تھی غافر
سمجھی تو جذب ہو کر رہ گئی ہے انکے پیکاں میں

جناب خواجہ رفیق علی صاحب فوق (لدھیانوی)

وہ عہد گل ہو یا دور خزاں صحن گلستاں میں
کبھی ہنستے ہوئے دیکھی نہیں دست گریباں میں

کبھی کیوں ہو گئی واقع جنون فتنہ ساماں میں
ابھی کچھ تار باقی ہیں میرے جیب و گریباں میں

وہ زخم دل کی کچھ چارہ گری فرمانے والے ہیں
تبسم انکے ہونٹوں پر چھپا ہے ریگ نمکداں میں

مجھے غربت بھی یک گونہ وطن سے کم نہیں صیاد
میں خود قید قفس میں ہوں مگر دل ہے گلستاں میں

جنوں انگیز پاتا ہوں میں اکثر چاندنی راتیں
کسی کے روئے تاباں کی جھلک ہے ماہ تاباں میں

گری اشک ندامت میں ابھی اے فوق کیا معنی
بہت سے داغ عصیاں ہیں ابھی تو جیب داماں میں

(جناب قاسم علی صاحب قاسم فرید آبادی)

بہلتی ہی نہیں ہے طبیعت باغ رضواں میں
الٰہی بھیج دے واپس مجھے پھر کوئے جاناں میں

کہاں ڈھونڈوں میں اسکا پھول سا چہرہ کہاں جاؤں
یہ وحشت ہے کہ دل لگتا نہیں میرا گلستاں میں

بہت اہل نظر تصویر جاناں کھینچنے پہنچے
مگر خود وہ گئے تصویر بن کر بزم جاناں میں

نقاہت اک قدم آگے مجھے بڑھنے نہیں دیتی
اڑا کر مجھ کو لے جائے صبا ہی کوئے جاناں میں

کہاں اب پاس مذہب ہے کہاں ناموس دیں باقی
خلل انداز اک بت ہو گیا ہے میرے ایماں میں

جلا کر خاک کر ڈالوں گا اے چرخ کہن تجھکو
شرر موجود ہے بجلی کا میری آہ سوزاں میں

وفاداری کے بدلے اپنی قاسم سے جفا کاری
بتاؤں فرق کیوں آیا تمہارے عہد و پیماں میں

شہاب دہلوی

اجل جو ابھی ہوتی ہے گلوں کی چاک داماں میں
بہار آئینہ دار بے ثباتی ہے گلستاں میں

بہار مستقل کا دور دورہ ہو گلستاں میں
الٰہی حشر تک دامن بنے دست گریباں ہو

خیال زلف بھی غلطاں ہے پیچیدہ جاناں میں
خلل انداز ہوتا جا رہا ہے کفر ایماں میں

دل بیتاب کے زخموں پہ جب مسکرانے دیا
گل مقصود پاتا ہوں میں اپنے [illegible] داماں میں

انتخابِ مشاعرہ حیدری

مصرع طرح :۔ آرام لیکے مجھے آلام دیگئے

مسیح الکلام حضرت حکیم کیفؔ (دہلوی)

وہ ذوقِ دید آج سرِ شام دیگئے
کتنا نظر فریب مجھے کام دیگئے

فرضِ وفا پہ جاں ترے ناکام دیگئے
گو جان سے گئے مگر انجام دیگئے

اک یادِ زلف و رخ کا وہ پیغام دیگئے
دنیا کو گردشِ سحر و شام دیگئے

قربان انکی آہنی جوانی پہ جان و دل
نیچی نظر سے آرزوئے تام دیگئے

وہ خاک میرے عشق کا احسان مانتے
اُلٹا مجھی کو سینکڑوں الزام دیگئے

مجھ کو تو مِش نے بھی مزہ نوش کا دیا
آلامِ عشق بھی مجھے آرام دیگئے

خدماتِ عشق و فرضِ وفا کچھ اہم نہیں
اک دن سنو گے تم کہ ہم انجام دیگئے

اہلِ نظر کو تم نے کیا وقفِ جستجو
خاصانِ عشق کو روشِ عام دیگئے

اب میں ہوں اور عشق کی جانسوز شیں
مجھکو میرے خلاف وہ پیغام دیگئے

اللہ رے کیفؔ انکی وہ مستی بھری نگاہ
جیسے کہ ایک روح فزا جام دیگئے

از مسٹر غلام عباس صاحب زاہرؔ سانکھوی

بگڑے کھنچے تنے مجھے دشنام دیگئے
وہ ایک فرض کیا کئی انجام دیگئے

ہنگامِ دید وہ غمِ انجام دیگئے
سو کام کا یہ ایک مجھے کام دیگئے

تم مژدۂ نظارۂ سرِ شام دیگئے
سارے جہاں کو صبح کا پیغام دیگئے

کشمکش سے شیخ و برہمن کی دور ہوں
نقشِ قدم کے سجدے مجھ کو کام دیگئے

ہونٹوں میں آنکھیں ڈالکے سنیں بہاریں
تم زندگی نواز مجھے جام دیگئے

دیوانگی و گریہ و فریاد و اضطراب
قربان انکے مجھ بہت کام دیگئے

تمنے کچھ اہلِ عشق و ہوس میں کی تمیز
تم سوزِ غم مجھے غلط انعام دیگئے

پردے میں آپ کیا تھے مرے تن میں جان تھی
پردہ اٹھا کے موت کا پیغام دیگئے

زاہرؔ نہ آئیں بارِ جفا و ستم رہا
کاندھا جو وہ جنازہ کو دو گام دیگئے

منتقمؔ سینتھلوی بی اے

وہ مجھ کو یادِ زلفِ سیہ فام دیگئے
یادش بخیر گردشِ ایام دیگئے

اک داغ صبح دیگئے اک شام دیگئے
کتنے وہ آفتابِ لبِ بام دیگئے

اب عمر ہوگی حسرتِ تکمیل میں تمام
اچھا ہوا وہ حسرتِ ناکام دیگئے

ہنگامِ نزع انکے ستم کی نہ پوچھیے
آنکھوں میں آنکھیں ڈالکے اک جام دیگئے

کیا عرضِ آرزو بھی گناہِ عظیم ہے
وہ کیوں جگر کے سینکڑوں الزام دیگئے

ہر وقت ہوں خیالِ رخ و زلف میں اسیر
وہ مجھ کو گردشِ سحر و شام دیگئے

پھر اپنا برقِ حسن سے خیرہ نگاہ کی
وہ پھر مجھے فریبِ لبِ بام دیگئے

قسمت نہ تیری تو مسلم تھی ہجر میں
داغِ جگر بھی تو نہ سرِ شام دیگئے

غافل رہا نہ اپنے فرائض سے منتقمؔ
دشمن کے داؤں گھات بڑا کام دیگئے

شہابؔ دہلوی

وہ لطفِ دید آکے لبِ بام دیگئے
گویا ثبوتِ صبح سرِ شام دیگئے

آنکھوں کو اشک، قلب کو آلام دیگئے
وہ دشمنوں کے فرض ہی انجام دیگئے

آغازِ غم کے مرحلے انجام دیگئے
ناکامِ آرزو بھی بڑا کام دیگئے

وہ تیرگی نظر کو لبِ بام دیگئے
صبحِ طرب کو تیرگیِ شام دیگئے

کعبے میں تم نے جلوہ دکھا کر غضب کیا
بیچارے شیخ کو طمعِ خام دیگئے

بخشی نگاہِ مست نے جاوید بیخودی
وہ ایک جام حاصلِ صد جام دیگئے

فرضِ فنائے عشق پہ تو غور کیجیے
کس خوبصورتی سے ہم انجام دیگئے

پھر وہ نگاہِ مست میری سمت اٹھ گئی
سہوا وہ مجھ کو جامِ پسِ جام دیگئے

سوجھی مثال کوہکن و قیس کی وہاں
کیا لوگ تھے یہ لوگ بھی کیا کام دیگئے

نازک لبوں پہ انکے ہنسی بھی لطیف تھی
رگ رگ کو مستیٔ مےِ گلفام دیگئے

جناب محمد زبیر خانصاحب زبیر (ٹونکی)

داغِ جگر جدائی کا پیغام دیگئے   دھوکا مجھے چراغِ سرِ شام دیگئے
وہ اپنی جستجو سے غم انجام دیگئے   ناکامِ آرزو کو بڑا کام دیگئے
جرمِ وفا پہ موت کا پیغام دیگئے   میں جسکا مستحق تہا وہ انعام دیگئے
گذرے وہ مجھ پہ ڈالکے مستی بہری نگاہ   گویا لبالب ایک مجھے جام دیگئے
رحمت خدا کی زمزمہ سنجانِ باغ پر   کس لیے کسی سے جان تہِ دام دیگئے
اک حلقہ میں نقطہ کو کیا مائلِ سرم   پلکوں پہ اشک آکے بڑا کام دیگئے
گو ہمنے بیکسی سے محبت میں جان دی   تہی یہ جو ہمپہ فرض تہا انجام دیگئے
خاصانِ عشق کا تہی ابتک تہی لقا   مجھکو بھی مژدۂ کرمِ عام دیگئے
ہنگام صبح زلفِ مسلسل دکہا کے وہ   اک غیر مختتم سی مجھے شام دیگئے
واں انکو ہجر میں انکے جئیگا کون   بیٹھے بٹھلائے مفت کا الزام دیگئے
بگڑے وہ میری موت پہ کفنانی میری لا   مجھ کو زبیر خلعت و انعام دیگئے

جناب صوفی محمد ابراہیم صاحب صوفی اجمیری قادر الکلام

انکو یہ چاہئے تہا یہ انعام دے گئے   آرام لے گئے مجھے آلام دے گئے
الفت کا حال اسلئے ہر اک پہ کھل گیا   بے وجہ بے قصور وہ دشنام دے گئے
خود اپنے آپ کو وہ سمجھتے ہیں نیک نام   میرا خطاب اس لئے بدنام دے گئے
محفل میں میکشوں کی نہ کیونکر ہجوم تہا
صوفی کو اپنے ہاتھ سے وہ جام دے گئے

جناب بابو سجاد علی صاحب سجاد بریلوی

وہ مجھکو عشق زلفِ سیاہ فام دیگئے   اندھیر ہے کہ دہوکا سرِ شام دیگئے
قصہ مٹا فراق کا آرام دیگئے   اچھا ہوا وہ موت کا پیغام دیگئے
دیکھا نگاہِ غیض سے دشنام دیگئے   کیا کیا مجھے وفا کا انعام دیگئے
ہر وقت سامنا ہے محبت میں موت کا   آغاز ہی میں وہ غم انجام دیگئے
اب جس کو دیکھئے وہ ہے ہتھیلی میں سر بکف   شاید وہ قتلِ عام کا پیغام دیگئے
اب کس امید پہ ہے تجھے آرزوئے وصل   وہ داغِ ہجر اسے دل ناکام دیگئے
کیا فتنہ خیز انکی گلی کی زمین ہیں   وہ آسماں کو کس لئے الزام دیگئے
وہ بے نیاز کر گئے دونوں جہان سے   اک ہوش فرسا آج مجھے جام دیگئے
دریائے رحمت آگیا سجاد جوش میں
اشکِ ندامت آج بڑا کام دیگئے

جناب حافظ سید محبت علی شاہ صاحب غفار نظامی

تنویر آفتاب لبِ بام دے گئے   کیسا کھلا فریب سرِ شام دے گئے
یہ کوسنے پڑے ہیں یہ دشنام دیگئے   لیجئے دعائیں لیکے وہ انعام دیگئے
دہوکہ بشکل گردشِ ایام دیگئے   آرام لیگئے مجھے آلام دیگئے
مرنے نہ دیگا پیچ رہیگا رخ و زلف کا مرض   دو بوسے تم اگر سحر و شام دیگئے
فرماگئے ہیں غفار بڑے بدگمان ہو
وہ آج اور مفت کا الزام دے گئے

جناب آرمورس سنگھ صاحب عارف (لدھیانوی)

آنکھوں میں آکے ضبط کا پیغام دیگئے   ہم کیوں کہیں کسی سے وہ کیا کام دیگئے
بالیں پہ آکے موت کا پیغام دیگئے   اک فرض تہا جو آج وہ انجام دیگئے
کتنی لطیف تہی لبِ جاں بخش پر ہنسی   وہ وقتِ نزع زیست کا پیغام دیگئے
رنگین کر گئے مری دنیائے آرزو   چھلکا کے اپنے ہاتھ سے وہ جام دیگئے
بے چین اس حسین کو دکھا خواب ناز میں   نالے شبِ فراق بڑا کام دیگئے
آئے تو بجلیاں سی گراتے ہوئے وہ آئے   وہ جب گئے تو ضبط کا احکام دیگئے
چہرہ دکھا کے زلفِ دوتا میں چھپا لیا   وہ دن دہاڑے مجھکو غمِ شام دیگئے
تم نے غمِ فراق کو مشکل سمجھ لیا   یہ کوئی کام بھی ہے کیا کام دیگئے
جلوے مری نگاہ میں عارف سما کر آج
اہلِ ہوس کو بہی طمعِ خام دیگئے

جناب تراب علی صاحب خلش نظامی دہلوی

دلکو خیالِ زلف سیہ فام دیگئے   جسکی سحر نہو کبہی وہ شام دیگئے
محشر کے روز ملنے کا پیغام دیگئے   یہ مجھ کو وہ وہ لے دل ناکام دیگئے
سنبل کو آکے دیگئے زلفوں کا پیچ و تاب   لالہ کو داغِ عارضِ گلفام دیگئے
گہ دلمیں یاد رخ کی کبہی ہی خیالِ زلف   مجھکو وہ گردش سحر و شام دیگئے
تربت پہ آکے کہہ گئے مجھ کو وہ بیوفا   مرنے کے بعد بہی مجھے الزام دیگئے
کیا کیا نشانیاں ہیں مجھے ہر یادگار
رنج و قلق خلش غم و آلام دیگئے

جناب محمد شریف صاحب شریف

وہ دید کی نوید لبِ بام دیگئے   تا حشر انتظار [illegible]
اک اک نگاہ میں تہیں ہزاروں نوازشیں   کیسا فریب [illegible]
مجھکو دکھا کے مست نگاہوں کی گردشیں   وہ جاتے [illegible]
کیا پوچھتے ہو اپنے شہیدوں کا حال تم   اک [illegible]
نقشِ قدم پہ آنکے [illegible]
ترغیب سجدہ [illegible] دیگئے

جناب عبدالرشید خاں صاحب۔ راشد دہلوی

آنکھیں ملا کے موت کا پیغام دیگئے
وہ زہر کے بجھے ہوئے دو جام دیگئے

آئے مزاج پوچھنے آلام دے گئے
کیا خوب فرضِ دوستی انجام دیگئے

[illegible] ہوئے وہ ضبط کے احکام دیگئے
وقفِ الم کو اور بھی آلام دیگئے

چہرہ پہ لیکے آج وہ گیسو بکھیر کر
جس شام کی سحر نہ ہو وہ شام دیگئے

لیے نفس نفس پہ ہے برق و شرر کا دام
وہ کس بلا کا آج مجھے جام دیگئے

وہ دل کے ساتھ طالبِ جان و جگر ہوئے
دو فرض ایک وقت میں انجام دیگئے

تنہا وہ کر دیا ہمیں کعبے کی قید سے
اس بت کے نقشِ پا ہی بڑا کام دیگئے

ہم ہی نہ گلستاں سے گئے دم دیتے بغیر
ہم ہی ثبوتِ عشق تہہ دام دیگئے

راشد نہ پوچھ انکی محبت کا مدعا
ایک کام دے گئے کہ وہ سو کام دیگئے

جناب حافظ منیر الدین صاحب منیر دہلوی تلمیذ مولانا راسخ مرحوم دہلوی

بس عیش میں جو خلق کو آرام دیگئے
آلام میں رہ خود ہیں جو آلام دیگئے

سمجھے نظر کے سامنے انکو ہے عمل
اللہ کے رسول جو پیغام دیگئے

سینے میں داغِ ہجرِ پیمبر ہے ضوفشاں
سامان روشنی کا سرِ شام دیگئے

دل میں ہے حبِ ابروئے حیدرِ مصطفےٰ
قربانیوں کے واسطے صمصام دیگئے

صلِ علیٰ الرسول ہے وردِ زبانِ دل
رتبے کیواسطے مجھے یہ نام دیگئے

پوچھتے ہو آپ کے آنے سے کیا ملا
ایمان دیگئے ہمیں اسلام دیگئے

مشکل نہیں خریدنی اب جنسِ آخرت
شاہوں کے پاس جو نہیں وہ دام دیگئے

ہے سوا امید سے اب دامنِ مراد
اسدرجہ اس فقیر کو انعام دیگئے

رہتی ہے جس سے آٹھ پہر بیخودی منیر
وہ جام مجھ کو ساقیِ گلفام دیگئے

جناب عبدالرشید صاحب شیدا گجراتی

راحت کے بدلے وہ غم و آلام دیگئے
میری وفا کا کیا مجھے انعام دیگئے

[illegible] ہجر و آرزوئے تام دیگئے
کیا کیا نہ تجھ کو اے دلِ ناکام دیگئے

[illegible] میری قسمت ہی حق میں نہیں ہے
لاتقنطو کا کیوں مجھے پیغام دیگئے

[illegible] بگڑ گئے میری قسمت بگڑ گئی
آرام لے گئے مجھے آلام دیگئے

[illegible] آپ [illegible] لطفِ نظر کی
میری وفا کو سینکڑوں الزام دیگئے

[illegible] ہو کوثر و تسنیم کو میں آج
نظریں ملا کے وہ مجھے دو جام دیگئے

شیدا مچل کے رہ گئی ہر آرزو مری
وہ دعوتِ نظارہ لبِ بام دیگئے

جناب خواجہ رفیق علی صاحب فوق (لدھیانوی)

وہ مجھ کو اپنی یادِ غم انجام دیگئے
یہ کام دے گئے تو بڑا کام دیگئے

یکسر [illegible] رہتا
اکثر تصورات بڑا کام دیگئے

[illegible]
خلوت کے چند لمحے بڑا کام دیگئے

تہمت لگی ہوئی ہے کسی ان سے عشق کی
وہ جام دے کے نہیں الزام دیگئے

اک اک نگاہ انکی بھی بجلی سی تھی
ہر ہر ادا پہ موت کا پیغام دیگئے

وہ چھپ گئے کہ چاند گھٹا میں چھپ گیا
یہ کیسی جستجو وہ سرِ شام دیگئے

اے ذوق کیا بتاؤں کہ ہنگام میکشی
کس مست مست نظروں سے وہ جام دیگئے

جناب ورد حیدری نندوربار ی

آرام لے گئے مجھے آلام دیگئے
اللہ کس خطا کا وہ انعام دیگئے

[illegible] وحشی آئے وہ جسکو خیال ہیں
دلپوش ہو گئے سے غمِ ایام دیگئے

جل بجھ کے لو میں شمعِ سرِ انجمن کی شب
پروانے سوزِ عشق کا پیغام دیگئے

ان کی نظر کے تیر تھے اعجازِ عیسوی
پیوستہ [illegible] آرام دیگئے

اے ورد جو بہانے تھے اعمال نشتہ پر
وہ اشک روزِ حشر بڑا کام دیگئے

جناب مولوی فضل الرحمن صاحب رہبر پرتابگڈھی

نیچی نظر سے دید کا پیغام دیگئے
وہ دل کو حسن کی ہوسِ خام دیگئے

دل کو مکاں بنا کے ہوئے وہ مکینِ عرش
یہ کیا کہ اک تسلیِ الہام دیگئے

دل کو بھی ایک مشغلہ ملنا ضرور تھا
ہم کو تو آپ گردشِ ایام دیگئے

دل تیرہ عشق خیرہ جہاں جیرہ سب ہے
جو جس کا اہل تھا اُسے وہ کام دیگئے

روزِ ازل ہی عشق تمام ہو چکا [illegible]
پھر کس صلے میں ضبط کے احکام دیگئے

ابتک کوئی حسین نہ ہوا مائلِ کرم
جتنے حسین ملے غم و آلام دیگئے

تم میں کہاں تھا حسن حسین تھی نگاہ
تم کس گمان میں مجھے الزام دیگئے

رہبر ہوا س و ہوش سے غافل نہیں رہا
اس بزم کے حسین بڑا کام دیگئے

جناب قاسم علی صاحب قاسم فرخ آبادی

اظہار مدعا پہ وہ دشنام دے گئے
انعام دینے آئے تھے انعام دیگئے

تو دلبری کا فرض وہ انجام دے گئے
دل لیکے مجھ کو موت کا پیغام دیگئے

قسمت میرے دل میں ہے اس طرح کی یا
وہ مجھ کو گردشِ سحر و شام دیگئے

دنیا کو میری اور [illegible]
وہ کیوں نصیب دید سرِ شام دیگئے

پھر اپنی برقِ حسن نہ کچھ کر دو تم ہوئے
پھر دل کو اضطراب کا پیغام دیگئے

انکی نگاہِ مست کی دل دل نہ پوچھ
بزمِ عدو میں مجھ کو بھی انجام دیگئے

محفل میں آج آمد و رفت انکی کیا کہوں
آرام لے گئے مجھے آلام دیگئے

[illegible]

تقریظ و تنقید

ترجمان الغیب صفحات ۳۳۲ - سائز ۲۶×۲۰/۸ لکھائی چھپائی عمدہ - کاغذ معمولی قیمت عہ/ مترجم جناب مولوی م
صاحب حق دہلوی ایم - اے (علیگ) ملنے کا پتہ :- خواجہ بکڈپو دہلی

خواجہ حافظ شیرازی کی غزلیات تمام دنیا میں مستقل شہرت کی حامل ہیں - اور خواجہ صاحب کو عموماً لسان الغیب سے کیا جاتا ہے اسی مناسبت سے احتشام الدین صاحب نے ان کی ۶۰۰ ہر دلعزیز غزلوں کا اُردو نظم میں ترجمہ کیا ہے اور نام بھی م ہے یعنی "ترجمان الغیب"۔ اسمیں شک نہیں کہ حافظ کے دیوان کا ترجمہ وہ بھی نظم میں غیر ممکن سی بات تھی - مولوی صاحب کی واقعی قابل ستائش ہے کہ ایک ناممکن سے کام کو ممکنات کی سرحد تک پہنچا دیا یعنی اصل اشعار کی معنویت اکثر برقرار ہے جہاں کا نے لفظی و معنوی صنائع بدائع سے شعر کا پایہ بلند کیا ہے مولویصاحب وہاں الجھ گئے ہیں اور حافظ صاحب کے اصل شعر سے کوئی نسبت نہیں رہی ہے - دراصل یہ ترجمے کا کام کوئی اُردو کا بڑا شاعر انجام دیتا تو چالیس پچاس فیصدی کامیابی یقینی تھی بنا پر سب سے دنیا کی واحد زبان ہے - اس کے مقابلے پر اُردو میں یہ بات نہیں - اُردو شعرا کو مصرعوں کے در تراکیب کی حلاوت - الفاظ کے انتخاب اور اسلوب بیان سے زبان کو شگفتہ اور فصیح بنانا پڑتا ہے - جو شاعر ان اُمور پر جتنی قدرت انتہائی کامیاب اور بڑا شاعر مانا جاتا ہے - معلوم ہوتا ہے مولوی صاحب کا رجحان طبع فن سخن اور شاعری کی طرف بہت کم رہا ہے کہ و اسقام جگہ بجگہ نظر آتے ہیں - تعقید معنوی و لفظی سے بیشتر اشعار مملو ہیں - حافظ صاحب کے کلام کے دو بڑے وصف ہیں - ایک دوسرے زبان کی صفائی مولوی صاحب دونوں وصف نہ نبھ سکے مثلاً حافظ صاحب کا یہ شعر

گر ز مسجد بہ خرابات شدم عیب مگیر — مجلس وعظ دراز ست و زماں خواہد شد

اس کا ترجمہ مولویصاحب اس طرح کرتے ہیں -

جائیں مسجد سے خرابات تو کچھ حرج نہیں — جلسہ وعظ تو تا دیر یہاں رہتا ہے

حافظ صاحب کے شعر میں جو طاقت اور زور ہے مولوی صاحب کے ہاں بالکل نہیں - اصل کے مقابلے پر ترجمے کا شعر ذرا قبول نہ کرے گا - حافظ کے اسی شعر کا ترجمہ قائم چاندپوری نے تقریباً سوا سو سال پہلے بڑی کامیابی سے کیا ہے ؎

مجلس وعظ تو تا دیر رہے گی قائم — یہ رہا میکدہ اب پی کے چلے آتے ہیں

پھر بھی ہمیں مولویصاحب کا ممنون ہونا چاہیے کہ مجموعی حیثیت سے انکی مساعی مساعی جمیلہ ہیں - دلدادگانِ حافظ تسکین ذوق کے لئے "ترجمان الغیب" من حیث الترجمہ ضرور تائید غیب ثابت ہوگا -

خیال آفریں دماغ ۵۶ صفحات - سائز ۲۶×۲۲/۱۶ لکھائی چھپائی اور کاغذ اعلیٰ مصنفہ جناب عرش تیموری دہلوی
قیمت ۶/ - ملنے کا پتہ :- حالی پبلشنگ ہاؤس - کتاب گھر دہلی -

اُردو میں اپنی نوع کی یہ پہلی کتاب ہے - جس میں ایک قابل مصنف کی افلاس سے پیدا شدہ ہیجانی اور اختلالی کیفیات کی تصویر کھی اور اس تصویر کو زیادہ سے زیادہ دل پذیر اور خوشگوار بنانے میں نئی نئی تشبیہات اور اچھوتے اچھوتے استعاروں کی رنگ آمیزی سے نا قدری زمانہ سے گھبرائے ہوئے شاعر کے تنہائی میں حرکات و سکنات اور گفتار و رفتار اس طرح ضبط تحریر میں لائے گئے ہیں کہ کہیں تو

کا گمان نہیں ہوتا اگر کوئی سنجیدہ آدمی اس کتاب کے مجوزہ وقفوں اور آواز کے زیر و بم زیر غور رکھ کر مطالعہ کرے تو نہ صرف وہ شخص خیال آفرین شعرا کے کردار سے مماثلت کرے بلکہ بے حد معنی یاب کیف و وجدان محسوس ہوں۔

مصنف نے اس کتاب کو جاذب توجہ بنانے میں از حد کوشش صرف کی ہے جو ہر طرح قابل ستائش ہے۔

مرزا گولڈ کا گھر میں چرچا

[illegible]

... کہ روز حشر پیام دیجئے ...

[illegible]

پیام نسواں لکھنؤ صفحات ۴۰۔ سائز $\frac{20 \times 30}{8}$ لکھائی چھپائی اور کاغذ بہترین سرورق یک رنگا مگر جاذب نظر قیمت سالانہ عہ فی پرچہ ۳ر۔ مدیرہ۔ محترمہ شمیم آرا بیگم صاحبہ بجنہ۔ حلقۂ اشاعت لکھنؤ

یہ عورتوں کا بہترین ماہانہ رسالہ ہے جو دو سال سے کامیابی کیساتھ نکل رہا ہے اسمیں ترقی۔ تعلیم اور تنظیم کیساتھ ساتھ اردو اور اردو شاعری کے متعلق عمدہ مضامین ہوتے ہیں۔ یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ نثر کے پندرہ ۱۵۔ سولہ ۱۶ مضامین کے مقابلہ میں نظم صرف ایک اور وہ بھی نصف صفحے پر سب سے آخر میں۔ محترمہ شمیم آرا بیگم بجنہ کو اس کی طرف بھی توجہ کرنی چاہئے کیونکہ بغیر نظم کے رسالہ پھیکا معلوم ہوتا ہے۔ یہ مانا کہ زیادہ نظم کا ہونا بھی اچھا نہیں مگر اس قدر بخل بھی تو شاعری کے باب میں نہیں چاہئے۔ مجموعی حیثیت سے رسالہ ہذا ترقی کی منازل طے کر رہا ہے خدا کرے پیام نسواں صحیح معنوں میں پیام نسواں ثابت ہو اور خاطر خواہ ترقی کرے۔

تیج ویکلی کا افسانہ نمبر دہلی کے مشہور اخبار "تیج ویکلی" نے گذشتہ کی طرح اس مرتبہ بھی افسانہ نمبر شائع کیا ہے یوں تو ہمیشہ ہی اس کا ہر نمبر خصوصیت کا درجہ رکھتا ہے مگر پیش نظر افسانہ نمبر تمام نمبروں سے گوئے سبقت لے گیا ہے۔ کاغذ کی اس ناقابل برداشت گرانی کے باوجود ۸۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں تقریباً پچیس وہ افسانے شامل ہیں جو خاص طور سے اسی نمبر کے لئے لکھے گئے ہیں انہیں مسٹر آصف علی بار ایٹ لا۔ علامہ کیفی دتاتریہ۔ مولانا سیماب اکبر آبادی مرزا ادیب بی۔ اے۔ محمد امین شرقپوری۔ کرشن منہاس۔ امن لکھنوی اور کوثر چاندپوری جیسے مشاہیر حضرات نے حصہ لیا ہے۔ ان کے علاوہ بھی ملک کے بہترین اہل قلم کے رشحات درج ہیں جو پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ بایں ہمہ قیمت ہنو کے برابر ہے یعنی صرف ۲ر حالانکہ اس قیمت پر ہر ہفتے معمولی تیج ویکلی بکتا ہے۔

شہاب دہلوی

ترجمان الغیب صفحات ۲۳۲ ۔ سائز [illegible] لکھائی چھپائی عمدہ۔ کاغذ معمولی قیمت ۸ مترجم جناب مولوی محمد احتشام الدین صاحب حقی دہلوی [illegible] ملنے کا پتہ:- خواجہ بکڈپو دہلی

خواجہ حافظ شیرازی کی غزلیات تمام دنیا میں مستقل شہرت کی حامل ہیں۔ اور خواجہ صاحب کو عموماً لسان الغیب سے خطاب کیا جاتا ہے اسی [illegible] مناسبت سے احتشام الدین صاحب نے ان کی ۶۰۰ ہر دلعزیز غزلوں کا اُردو نظم میں ترجمہ کیا ہے اور نام بھی مناسب حال ہے یعنی ترجمان الغیب [illegible] شک نہیں نہ حافظ کے دیوان کا ترجمہ وہ بھی نظم میں غیر ممکن سی بات تھی۔ مولوی صاحب کی محنت شاقہ واقعی قابل ستائش ہے کہ ایک ناممکن سے کام کو ممکنات کی سرحد تک پہنچا دیا۔ یعنی اصل اشعار کی معنویت اکثر برقرار ہے جہاں کہیں حافظ صاحب نے لفظی و [illegible] صنائع [illegible] سے شعر کا پایہ بلند کیا ہے مولوی صاحب وہاں الجھ گئے ہیں اور حافظ صاحب کے اصل شعر سے ترجمے کو [illegible] نسبت [illegible] اصل پر ترجمے کا کام کوئی اُردو [illegible] انجام دیتا تو چالیس پچاس فیصدی کامیابی یقینی تھی فارسی زبان [illegible] شیرینی اور لطافت [illegible] دنیا کی [illegible] اس کے تماشے [illegible] نہیں اُردو دشوار کو مصرعوں [illegible] دولت [illegible] کم گو [illegible]

بنگالے کا جادو

حیاتِ اویس

باہتمام سید مسعود حسن شہاب دہلوی کے انصاری پریس میں چھپ کر دفتر الہام سے شائع کیا۔

رُباعیاتِ حیدر کی اِنفرادی وافادی عظمت

الفاظ نگیں سے جڑ دئے حیدر نے
جذباتِ لطیف چن لئے حیدر نے
اے آمن رُباعیاں لکھی ہیں کیا خوب
نالے پابند کئے حیدر نے

(آمن لکھنوی)

موجودگی پر باذاق انسان کی ہنر پر فروزی ہے یہیں تک نہیں بلکہ اس کلام کے ساتھ مطالعہ پڑھنے والے کے سامنے بہت سی نئی راہیں کھولے گا۔

حیدر صاحب کا کلام انفرادیت کا وہ عنصر رکھتا ہے جس کی ایک اچھے شاعر کو بہت ضرورت ہے شگفتگی اور تازگی ہی ایک کلام کو دلپذیر بنا سکتی ہے اور یہ انکے ہاں کافی موجود ہے تخیل کا میدان بھی وسعت میں کم نہیں۔ مختصر یہ کہ ان کی شاعری ان ممکنات کو لئے ہوئے ہے جن سے اردو ادب اور شاعری کی امیدیں وابستہ ہیں۔ مجھے امید ہے ملک اس کلام کی قدر کرے گا۔

(کیفی دتاتریہ)

اردو کے ایک پختہ کار و پختہ مغز شاعر حضرت حیدر دہلوی کی رباعیات کا یہ پہلا مجموعہ ہے۔ حیدر ان شاعروں میں ہیں جن کا قدم تعریف و توصیف سے مستغنی ہے۔ جو اردو زبان پر حیرت انگیز قدرت رکھتے ہیں۔ یہ رباعیاں ایک عقیدت مند شاگرد نے جمع کر کے شائع کی ہیں اور بلا شبہ اس طرح اردو ادب کے ذخیرہ میں بہت قیمتی اضافہ کیا ہے۔

(مدینہ بجنور)

یہ خوشنما مجموعہ دہلی کے نامور شاعر حضرت حیدر دہلوی کی رباعیات کا ایک قابل قدر علمی ذخیرہ ہے۔ حضرت حیدر دہلوی کا شمار اسوقت ہندوستان کے ممتاز شعراء میں ہے۔ آپ کے کلام میں اعلیٰ تخیل اور جذبات نگاری کے ساتھ ساتھ ... ہے۔ ... میں سو سے زیادہ مؤثر اور دلگداز رباعیاں ... رباعی اپنی جگہ ایک مستقل مضمون یا نظم کی حیثیت رکھتی ہے جیسا کہا گیا ہے معلوم ہوتا ہے تخیل کے سمندر کو کوزے میں بند کر دیا گیا ہے جو حضرات ... ذوق رکھتے ہیں ان کے لئے یہ بہترین ذخیرہ ہے۔ کتابت طباعت نہایت عمدہ مجلد خوشنما سنہری حروف سے مزین۔ قیمت ایک روپیہ (عہ)

(دین و دنیا دہلی)

حضرت حیدر دہلوی کی حکیمانہ و فلسفیانہ رباعیات کا پہلا مجموعہ بہت ہی خوب صورت جیبی سائز پر شائع ہوا ہے۔

اِس میں شک نہیں کہ تمام اصناف سخن میں رباعی اہم ترین اور دشوار گذار صنف ہے فارسی میں خیام اور سرمد نے اس صنف میں کمالات کے دریا بہائے ہیں۔ اور اردو میں حضرت حیدر دہلوی نے اس طرح اس کمال کو اپنایا ہے کہ اس مجموعے کی ہر رباعی کو پڑھنے سے دل و دماغ پر ایک ایسا مستقل اور مفید اثر پڑتا ہے۔ ہر رباعی ایک پیغام کی حامل ہے اور ہر مقام میں حکیمانہ انداز موجود ہے۔

اِس مجموعہ میں تقریباً ایک سو بیس (۱۲۰) رباعیاں شامل ہیں۔ جن کو دس ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہم اردو ادب میں اس گرانقدر اضافہ پر حضرت حیدر کو مبارک باد دیتے ہیں۔

رباعیات حیدر کی کتابت طباعت اور ترتیب بھی اچھی ہے اور مصنف کی تصویر بھی اس مجموعے کی زینت ہے۔ قیمت ایک روپیہ۔

(تیج دہلی)

یہ مجموعہ ظاہر میں چھوٹا ہے۔ اتنا چھوٹا کہ کوٹ نہیں تو اوور کوٹ کی جیب میں ضرور تلاش کرنا پڑے لیکن اس کی معنوی خصوصیات اتنی وسیع اور اہم ہیں کہ اسکی

رباعیات حیدر کے بہت کم نسخے دفتر میں رہ گئے ہیں۔ جلد آرڈر دیجئے۔ ورنہ دوسرے ایڈیشن کا انتظار کرنا پڑے گا۔
قیمت:- فی جلد ایک روپیہ (عہ) علاوہ محصول ڈاک۔

مینیجر مکتبہ ادارۂ حیدری جامع مسجد دہلی